Regd. L. No. 7243

Phone, 80806

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جولائی 1973

اس پرچے میں

خدا کیلئے رُک جائیے!

مودودی صاحب سے ایک دردمندانہ اپیل

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵-بی - گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

فکرِ نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدل اشتراک

پاکستان

سالانہ ——— دس روپے

غیر ممالک

سالانہ ——— ایک پونڈ

ٹیلیفون

۸۰۸۰۰

خط و کتابت

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

قیمت فی پرچہ

ایک روپیہ

جلد ۲۶ | جولائی ۱۹۷۳ء | نمبر ۷

فہرست

۱۔ لمعات ——— ۲

۲۔ تفہیم القرآن (جلد ششم) پر ایک نظر ۔ شاہد عادل ——— ۹

۳۔ خدا کے لئے رک جائیے ——— ۲۵

۴۔ مجلس مذاکرہ (کنونشن نومبر ۷۲ء قسط ۳) ——— ۳۴

۵۔ ظالم پنپ نہیں سکتا ——— (محترم پرویز صاحب) ——— ۴۱

ڑ محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق۔ مقام اشاعت [illegible] بی گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر شیخ محمد اشرف۔ مطبوعہ اشرف پریس ایبک روڈ۔ لاہور۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لمعات

قوم اور اُمّت

ہمارا دور بھی عجیب و غریب ہے۔ اس میں لوگ مسلمان ہونے کے مدعی بھی ہوتے ہیں اور اسلام کے (فروعات نہیں بلکہ) مسلمات سے انکار بھی کرتے ہیں ـــ انکار ہی نہیں کرتے بلکہ اس انکار پر اصرار کرتے ہیں، اور اپنے اس انکار کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے بحث بھی کرتے ہیں۔

۲۔ اسلام کے بنیادی مسلمات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے پوری نوعِ انسان کی تقسیم دو گروہوں میں کی ہے اور اس تقسیم کا معیار کفر اور ایمان ہے۔ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنكُمْ كَافِرٌ وَمِنكُم مُّؤْمِنٌ ۔ (۶۴/۲) خدا نے تمہیں پیدا کیا۔ سو تم میں سے ایک گروہ کفار کا ہے اور ایک گروہ مومنین کا ـــ اس معیارِ تقسیم و تفریق کی رُو سے، دنیا میں بسنے والے تمام مسلم ایک گروہ کے افراد ہیں اور غیر مسلم دوسرے گروہ کے افراد۔ اسی کو (دورِ حاضر کی اصطلاح میں) دو قومی نظریہ کہتے ہیں۔ اس نظریہ کی رُو سے، دنیا کے تمام مسلمان ایک قوم کے افراد قرار پاتے ہیں۔

جب ہم اس قرآنی نظریۂ تقسیم کو پیش کرتے ہیں تو اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اگر اس نظریہ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ (مثلاً) پاکستان اور افغانستان میں دو الگ الگ قومیں نہیں بستیں، یہ ایک ہی قوم ہے۔ اور اس سے آگے یہ کہ پاکستان اور افغانستان کیا، اس نظریہ کی رُو سے، تمام مسلم ممالک میں بسنے والے افراد ایک قوم ہیں۔ اور یہ بات خلافِ حقیقت ہے۔ مختلف اسلامی ممالک کے مسلمان الگ الگ قومیں ہیں۔ اور چونکہ وہ الگ الگ قومیں ہیں، اس لئے اس سے واضح ہے کہ اسلام میں قومیت کا معیار ایمان کا اشتراک نہیں، وطن کا اشتراک ہے۔ لہٰذا یہ دعوےٰ غلط ہے کہ اسلام میں قومیت کا معیار، ایمان کا اشتراک ہے۔

آپ نے اس منطق کے صغریٰ کبریٰ پر غور فرمایا؟ وہ صغریٰ کبریٰ یہ ہے کہ چونکہ اس وقت مختلف ممالک میں بسنے والے مسلمان اپنے آپ کو الگ الگ قوم سمجھتے ہیں، اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام کی رُو سے معیارِ قومیت، ایمان کا اشتراک ہے۔

یعنی ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم کی نصِ صریح کی رُو سے، معیارِ قومیت کفر اور اسلام کا اختلاف ہے۔ اور ان حضرات کا ارشاد ہے کہ چونکہ موجودہ مسلمانوں کا عمل اس کے خلاف ہے، اس لئے یہ دعویٰ غلط ہے کہ اسلام کی رُو سے معیارِ قومیت، ایمان کا اشتراک ہے! ذرا اس دلیل کو آگے بڑھایئے اور دیکھئے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے! قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ .... الخ (۳۰/۳۱-۳۲)

مسلمانو: تم اسلام لانے کے بعد پھر سے مشرکین میں سے نہ ہو جانا یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے۔

اور آپ اس کی تردید میں کہتے ہیں کہ نہیں! چونکہ مسلمانوں میں ہر جگہ فرقے موجود ہیں اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام میں فرقہ سازی شرک ہے۔

یا یہ کہ قرآن کریم میں ہے کہ

مَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (۵/۴۴)

جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔

اور آپ کہتے ہیں کہ اس وقت کوئی اسلامی مملکت بھی ایسی نہیں جہاں حکومت کتاب اللہ کے مطابق قائم ہو۔ اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔

یہ ہے منطقی نتیجہ اس دلیل کا کہ چونکہ مختلف ممالک میں بسنے والے مسلمان اپنے آپ کو الگ الگ قومیں سمجھتے ہیں اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام میں معیارِ قومیت ایمان کا اشتراک ہے۔ یعنی ان حضرات کے نزدیک غلط اور صحیح کا معیار مسلمانوں کا موجودہ عمل ہے نہ کہ قرآن کریم کا فیصلہ۔ اس دلیل کا بودا پن کسی دلیل کا محتاج نہیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم کی رو سے نوعِ انسان کے دو ہی گروہ ہیں۔ کافر اور مومن۔ سوال یہ ہے کہ اس معیارِ تقسیم کی رو سے ایمان کے اشتراک کی بنا پر جو گروہ "وجود میں آتا ہے اس کے متعلق قرآن کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

(۱) وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (۲/۱۴۳) اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی امت بنایا تاکہ تم نوعِ انسان کے اعمال کے نگران ہو اور رسول تمہارے اعمال کا نگران رہے۔ سوال یہ ہے کہ اس طرح سے جو امت وجود میں آئی تھی، وہ کسی خاص خطۂ زمین میں بسنے والے مسلمانوں پر مشتمل تھی یا ساری دنیا میں بسنے والے مسلمانوں پر؟ اس آیت میں جَعَلْنَاكُمْ اور عَلَيْكُمْ میں (كُمْ) کی ضمیر کا اطلاق کسی خاص وطن کے مسلمانوں پر ہوتا تھا یا تمام دنیا میں بسنے والے مسلمانوں پر؟ اس میں شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ کا فریضہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا تھا یا کسی خاص خطۂ ارض میں بسنے والے مسلمانوں کا؟ اس میں رسول کی نگرانی کسی خاص ملک کے مسلمانوں تک محدود تھی یا ساری دنیا کے مسلمان اس کے احاطہ میں آجاتے تھے؟ فرمائیے کہ اس میں وہ کون سا جزو تھا جو کسی ایک ملک میں بسنے والے مسلمانوں کو دوسرے مسلمانوں سے الگ کرتا تھا۔ اس آیت کی رو سے خدا نے ایک امت متشکل کی تھی۔ اُمم متشکل نہیں کی تھیں۔ اس نے کہیں بھی امتِ عربیہ، امتِ مصریہ، امتِ ایرانیہ، امتِ عراقیہ وغیرہ نہیں کہا تھا۔

(۲) اس نے دوسری جگہ کہا ہے۔ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ...... (۳/۱۰۹) تم ایک بہترین امت ہو جسے نوعِ انسان کی بہبود کے لئے مبعوث کیا گیا ہے۔ اس میں بھی وہی سوال پیدا ہوتا ہے كُنْتُمْ (تم) کی ضمیر کسی خاص خطۂ زمین کے مسلمانوں کے لئے ہے یا تمام دنیا میں بسنے والے مسلمانوں کے لئے؟ یہ جو النّاس کی منفعت کے لئے امت کی تشکیل کی گئی تھی وہ کسی خاص وطن میں محصور تھی یا ساری دنیا میں پھیلی ہوتی تھی؟

(۳) قرآن کریم کہتا ہے کہ ایمان کے اشتراک کی بنا پر جو امت وجود میں آتی ہے وہ مکان کے اعتبار ہی سے حدود فراموش نہیں ہوتی، زمان کے اعتبار سے بھی قیود نا آشنا ہوتی ہے۔ یعنی یہی نہیں کہ کسی ایک زمانے میں مختلف ممالک میں بسنے والے

مومن ایک امت کے افراد ہوتے ہیں بلکہ اس نظریہ پر ایمان رکھنے والے دنیا میں جب اور جہاں کہیں ہو گزرے ہیں، وہ سب ایک ہی امت کے افراد تھے۔ اس نے تاریخ کے مختلف ادوار میں، مختلف ممالک میں پیدا ہونے والے حضرات انبیاء کرامؑ کا نام بنام ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ۔ (۲۱/۹۲، ۲۳/۵۲) "یہ سب ایک ہی امت تھے" اور ان کے ایک امت ہونے کی بنیاد یہ تھی کہ وہ ایک ہی خدا کی محکومیت اختیار کئے ہوئے تھے۔ واضح رہے کہ چونکہ امت کی تشکیل اس کے نبی کی نسبت سے ہوتی ہے اس لئے قرآن کریم نے جو مختلف انبیاء کرامؑ کا ذکر کر کے انہیں امت واحدہ قرار دیا ہے تو اس سے مفہوم یہی ہے کہ ان کے متبعین ایک ہی امت کے افراد تھے۔ اس سے واضح ہے کہ کسی ایک خطۂ زمین کے، ایک ہی زمانہ کے مومن ہی ایک امت نہیں، اس اصول کو ماننے والے شروع سے آج تک ایک ہی امت کے افراد ہیں۔ اس نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اس امت کا نام بھی شروع سے آج تک ایک ہی رہا ہے۔ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا (۲۲/۷۸)۔ اس نے اس سے پہلے بھی تمہارا نام مسلم رکھا تھا اور اس قرآن میں بھی یہی نام رکھا گیا ہے لہٰذا حضرت نوحؑ سے لے کر آج تک جن لوگوں نے بھی ایمان کے اشتراک کو معیارِ قومیت تسلیم کر لیا، وہ امتِ مسلمہ کے افراد قرار پا گئے، بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ کس زمانے میں گزرے ہیں اور کون سے ملک میں بستے تھے۔

(۷) قرآن کریم نے انہیں امت کہہ کر ہی نہیں پکارا۔ وہ ایک قدم آگے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ سب اِخْوَةٌ (بھائی بھائی) ہیں۔ سورۂ آل عمران میں ہے کہ

> تم حبل اللہ (کتاب اللہ) کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور خدا کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اس نے تمہارے دلوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا۔ اور یوں اپنی نعمت سے تمہیں باہمی بھائی بھائی بنا دیا۔ (۳/۱۰۳)

ظاہر ہے کہ اس رشتۂ اخوت سے کسی ایک وطن کے مسلمان ہی پیوست نہیں۔ اس میں ساری دنیا کے مسلمان منسلک ہیں۔ اور یہ رشتہ، اعتصام بحبل اللہ (قرآن سے وابستگی) یا ایمان ہے جیسا کہ دوسری جگہ یہ کہہ کر اس کی وضاحت کر دی کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (۴۹/۱۰) حقیقت یہ ہے کہ (کسی ایک خطۂ زمین کے نہیں بلکہ ساری دنیا میں بسنے والے) مومن ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اخوت کا رشتہ قومیت کے رشتہ سے کہیں زیادہ عمیق اور مستحکم ہوتا ہے۔ یہاں یہ کہا کہ مومن ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ جس کا مطلب واضح ہے کہ اخوت کے اس رشتہ کی بنیاد ایمان کا اشتراک ہے۔ جو لوگ ایمان میں ان سے شریک نہیں وہ اس زمرہ میں شامل نہیں ہو سکتے۔ اگر وہ اس میں داخل ہونا چاہیں تو وہ صرف ایمان لانے سے ہی ایسا کر سکتے ہیں۔ غور کیجئے۔ عرب کے رہنے والے غیر مسلم (مشرکین قریش) اور مسلمان، وطن۔ نسل۔ رنگ۔ زبان کے اشتراک کے باوجود، ایک امت کے افراد قرار نہیں پا سکے۔ ان کے متعلق واضح الفاظ میں کہا گیا کہ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ .... (۹/۱۱) اگر یہ اپنی موجودہ کفر کی روش سے تائب ہو کر تمہارے ساتھ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے فریضہ میں شریک ہو جائیں تو پھر یہ "دین میں تمہارے بھائی" بن سکتے ہیں (یعنی ان کے اور تمہارے درمیان تمام مشترک عناصر (نسل، رنگ، زبان، وطن وغیرہ کا اشتراک) انہیں تمہارا بھائی نہیں بنا سکتا۔۔۔ حالانکہ ان میں سے اکثر و بیشتر خونی رشتہ کی بنا پر بھی بعض مسلمانوں کے بھائی تھے۔ یہ دین کے اشتراک کی بنا پر تمہارے بھائی بن سکتے ہیں۔

اور یہ رشتۂ اخوت کسی ایک دور کے مومنین تک ہی محدود نہیں بلکہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، یہ گزرے ہوئے زمانے کے مومنین تک

کو بھی محیط ہے۔ چنانچہ قرآن نے ہر دور کے مسلمانوں سے کہا ہے کہ ان کی دعا یہ ہونی چاہیئے کہ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ لِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ۔ (۵۹/۱۰) اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں بھی مغفرت عطا فرما اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ایمان کے ساتھ ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ ایمان کے اشتراک کی بنا پر متشکل ہونے والی اُمت کس طرح زمان اور مکان کے حدود سے ماوراء ہوتی ہے۔ افرادِ اُمت میں باہمی رشتہ قومیت ہی کا نہیں ہوتا۔ اس لئے کہیں گہرا اخوت کا رشتہ ہوتا ہے۔

(۰)

آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ قرآن کریم کی اس قدر واضح تعلیم کی موجودگی میں 'وطنیت' کو معیارِ قومیت قرار دینے والے مسلمان، اپنے دعوے کی تائید میں دلیل کیا لاتے ہیں۔ وہ بھی سن لیجئے۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ قرآن نے ایمان کے اشتراک کی بنا پر اُمت بنائی ہے، قوم نہیں بنائی۔ ایمان کے اشتراک سے اُمت وجود میں آتی ہے اور وطن کے اشتراک سے قوم۔ تحریکِ پاکستان کے دوران 'دو قومی نظریہ' کے مخالف یہی دلیل لایا کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان مذہب کی بنا پر ایک اُمت ہیں۔ لیکن ہندوستان میں بسنے کی بنا پر وہ اور غیر مسلم سب ایک (ہندوستانی) قوم کے افراد ہیں۔ اس دلیل کی بنا پر وہ کہا کرتے تھے کہ تمام دنیا کے مسلمان مذہب کی بنا پر ایک اُمت ضرور ہیں، لیکن مختلف ملکوں کے باشندے ہونے کی بنا پر ان کی قومیتیں الگ الگ ہیں۔ اور امت اور قوم کی یہ تفریق درحقیقت مذہب اور دین کی تفریق پر مبنی ہے۔ مذہب میں واقعی یہ ہوتا ہے کہ ایک ملک کے باشندے اپنا الگ الگ مذہب رکھتے ہیں لیکن قومیت ان سب کی ایک ہی ہوتی ہے۔ لیکن دین میں اس قسم کی ثنویت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ثنویت سیکولرازم کی پیدا کردہ ہے۔ دین میں امت اور قوم میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ہندوستان میں متحدہ قومیت کے حامی مسلمانوں کی فریب خوردگی یا مغالطہ آفرینی کی وجہ یہ تھی کہ مغرب سے آمدہ نیشن (NATION) کے لفظ کا ترجمہ قوم کیا گیا۔ اور اس کے بعد کہا گیا کہ قرآن نے مسلمانوں کو جداگانہ امت قرار دیا ہے۔ جداگانہ قوم نہیں قرار دیا۔ مذہب کے اعتبار سے وہ غیر مسلموں سے الگ امت ہیں، لیکن سیاسی نقطۂ نگاہ سے وہ اور غیر مسلم مل کر ایک قوم کے افراد قرار پاتے ہیں۔ یہی وہ سیکولرازم یا ثنویت (DUALITY) تھی جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ

جو ہو پرانا کلیسا وہ مذہب کا کفن ہے!

اس میں شبہ نہیں کہ عربوں کے ہاں (جن کی زبان میں قرآن نازل ہوا تھا) اور زمانۂ نزولِ قرآن میں قوم کے لفظ نے وہ سیاسی مفہوم اختیار نہیں کیا تھا جو عصرِ حاضر میں مغربی تصورِ قومیت کی رو سے آجکل رائج ہے (وہ تو بلکہ قوم میں عورتوں کو بھی شامل نہیں کیا کرتے تھے)۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ قرآن کریم نے اس مقصد کے لئے امت کا لفظ ہی نہیں قوم کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ سورۃ اعراف میں ہے کہ قرآن کریم میں ہدایت و رحمت ہے لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ (۷/۵۲) ایمان لانے والی قوم کے لئے۔ (دیگر کئی ایک مقامات پر بھی یہ الفاظ آئے ہیں) اس کے برعکس سورۃ یونس میں ہے کہ خدا کی آیات اور تنبیہات کچھ فائدہ نہیں دے سکتیں عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُونَ (۱۰/۱۰۱) اس قوم کو جو ایمان نہیں لاتی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم نے مسلم اور غیر مسلم کے لئے قوم کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ پھر ان کے لئے دو الگ الگ اصطلاحات ہی استعمال نہیں کیں بلکہ یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ ان میں باہمی تعلقات کس قسم کے ہوں گے۔ غور سے دیکھیے۔ فرمایا۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ

كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ..... (۵۸/۲۲)

تم کبھی ایسا نہیں دیکھو گے کہ جو قوم خدا اور آخرت پر ایمان رکھتی ہے، وہ ان لوگوں سے دوستی کے تعلقات قائم کرے جو خدا اور رسول (یعنی اسلامی نظام) کی مخالفت کریں۔ خواہ وہ ان کے ماں باپ، اولاد، بھائی اور دیگر افرادِ خاندان ہی کیوں نہ ہوں۔

یہ ہے ان دونوں قوموں میں اختلاف کی نوعیت! آپ محض اشتراکِ وطن کی بنا پر انہیں ایک قوم قرار دیتے ہیں اور قرآن کریم ایمان کے اختلاف کی وجہ سے، باہمی رشتہ داریوں تک کے تعلقات بھی منقطع کر دیتا ہے۔ ذرا سوچئے کہ اس کے بعد ان دو متضاد نظریاتِ زندگی کے حامل افراد ایک قوم کے افراد بن سکتے ہیں؟ واضح رہے کہ قرآن کریم کی رُو سے ہر غیر مسلم "خدا و رسول" (اسلامی نظام) کا مخالف ہوتا ہے۔ کافر و مومن کا ایک قوم کے افراد قرار پانا تو ایک طرف، قوم مومنین کو دعا یہ سکھائی گئی ہے کہ فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (۲/۲۸۶) ہمیں قوم کافرین پر غلبہ و نصرت عطا فرما۔ فرمائیے! سینہ میں اس قسم کی آرزوئیں رکھنے اور ان کا اس طرح اعلان کرنے والے غیر مسلموں کے ساتھ مل کر ایک قوم بن سکتے ہیں!

(۵)

اس سلسلہ میں ایک دلیل اور بھی دی جاتی ہے قرآن کریم میں ہے کہ اگر ایک مومن سہواً اور نادانستہ کسی مومن کو قتل کر دے تو اس کی دیت (خون بہا) دی جائے گی۔ قرآن نے اس خون بہا کی ادائیگی کا طریق بتاتے ہوئے کہا ہے کہ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۔ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ..... (۴/۹۲) اگر مقتول مومن ہو لیکن اس قوم سے متعلق ہو جس کے ساتھ تمہاری عداوت ہے تو پھر دیت یوں دی جائے گی۔ اور اگر اس قوم سے متعلق ہو جس کے ساتھ تمہارے معاہدانہ تعلقات ہیں تو پھر اس طرح ..... اس سے استدلال یہ کیا جاتا ہے کہ دیکھئے قرآن اس کا امکان تسلیم کرتا ہے کہ ایک مومن، اس قوم کا فرد بھی ہو سکتا ہے جس کے ساتھ تمہارے دشمنی کے تعلقات ہوں یا میثاقی تعلقات۔ یہ قوم بہرحال غیر مسلموں کی ہو گی۔ اس سے ظاہر ہے کہ مسلمان، غیر مسلموں کی قوم کے افراد بھی ہو سکتے ہیں۔

یہ دلیل یوں ہی سمجھئے، جیسے کوئی شخص ہاتھی گزارنے کے لئے تنکوں کے پل بنائے۔ ایسا کہنے والے یہ قطعاً بھول جاتے ہیں کہ وہ حالات کیا تھے جن میں قرآن نے ایسا کہا تھا؟ ابتدائے اسلام میں کیفیت یہ تھی کہ مختلف قبائل میں اکا دکا لوگ ایمان لے آتے تھے۔ وہ مسلمان تو ہو جاتے تھے لیکن رہتے تھے اپنے ہی قبیلہ میں۔ ان کے لئے ان حالات میں اس کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہیں تھا۔ خود مکہ کے مسلمان اُسی مکہ میں اُسی قوم قریش میں رہتے تھے، اور مدینہ کے مسلمان بھی مدینہ کی مخلوط آبادی کے افراد تھے۔ یہی کیفیت مختلف قبائل میں رہنے والے مسلمانوں کی تھی۔ مندرجہ بالا آیت میں دیت کے متعلق جو احکام دیئے گئے ہیں وہ ایسے ہی مسلمانوں کے متعلق ہیں۔

اس کے بعد جب ایک ایسا مقام میسر آ گیا جہاں اسلامی مملکت کے قیام کے امکانات روشن تھے (یعنی مدینہ) تو مکہ کی جماعت ہجرت کر کے وہاں منتقل ہو گئی۔ جب وہاں اپنی آزاد مملکت قائم ہو گئی تو جہاں جہاں بھی مسلمان بستے تھے ان سے کہہ دیا کہ وہ بھی ہجرت کر کے مدینہ آ جائیں۔ ان میں بعض ایسے تھے جنہیں دشمنوں نے اس طرح محصور کر رکھا تھا کہ وہ وہاں سے نکل نہیں سکتے تھے۔ انہیں اس حکم سے مستثنیٰ قرار دے کر کہا گیا کہ وہ انتظار کریں تا آنکہ ان کے وہاں سے منتقل

کرانے کا انتظام کیا جاسکے۔ اس دوران میں ان کی ہر ممکن اعانت اور خبر گیری کا خیال رکھا جائے گا۔ یعنی یہ وہ لوگ تھے جو وہاں سے نکلنے کے لئے ہر وقت مضطرب و بیقرار رہتے تھے لیکن بامر مجبوری ایسا کر نہیں پا سکتے تھے (۴/۷۵ ؛ ۴/۹۸)۔ اور یہی تھے جنہیں وہاں سے نکالنے کے لئے آخر الامر مملکتِ اسلامیہ کو جنگ کا حکم دیا گیا۔ (۴/۷۵)

کچھ لوگ (مسلمان) ایسے بھی تھے جنہیں ہجرت کے امکانات حاصل تھے لیکن وہ وہاں سے آنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں آپ (عصر حاضر کی اصطلاح میں) "متحدہ قومیت" کے حامی کہہ سکتے ہیں۔ یعنی یہ "مذہب" کی حیثیت سے تو مسلمان رہنا چاہتے تھے لیکن اپنی قومی حیثیت وطنی یا نسلی رکھنا چاہتے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن کریم نے ان کے متعلق کیا کہا؟ یہ کہا کہ یہ لوگ منافق ہیں۔ چاہتے یہ ہیں کہ جس طرح خود دعویٰ ایمان کے باوجود کافر رہنا پسند کرتے ہیں تمہیں بھی کافر بنا دیں۔ فَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ. (۴/۸۹) انہیں کبھی اپنا دوست نہ سمجھو تاوقتیکہ یہ وہاں کے لوگوں سے قطع تعلق کر کے تمہارے ہاں نہ آجائیں۔ اور اگر یہ یہاں آنے کے بعد پھر اپنی سابقہ قومیت کی طرف پلٹنا چاہیں تو ان سے بھی اسی طرح جنگ کرو جس طرح دوسرے دشمنوں سے جنگ کی جاتی ہے (۴/۸۹)۔ اس سے ذرا آگے جا کر کہا کہ موت کے وقت ان لوگوں سے ملائکہ پوچھیں گے کہ تم ان لوگوں میں کیوں رہے؟ تو یہ جواب میں کہیں گے کہ ہم کیا کرتے ہم مجبور تھے۔ جواب دیا جائیگا کہ تم مجبور کیوں تھے؟ خدا کی زمین وسیع تھی اور تمہیں نقلِ مکانی کے امکانات حاصل تھے پھر یہ عذر کیسا؟ چنانچہ انہیں جہنم میں دھکیل دیا جائے گا۔ (۴/۹۷)

ہم ان حضرات سے جو یہ کہتے ہیں کہ اگر کسی مسلمان کو مذہبی آزادی حاصل ہو تو وہ اشتراکِ وطن کی بنا پر غیر مسلموں کی قوم کا فرد بن کر رہ سکتا ہے، یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اس پر غور کریں کہ جن مسلمانوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ مسلمان رہنا چاہتے تھے اور مسلمان رہنے میں انہیں کسی قسم کی دشواری بھی نہیں تھی۔ پھر وہ کونسی بات تھی جس کی بنا پر قرآن انہیں جہنمی قرار دے رہا ہے اور مسلمانوں سے کہہ رہا ہے کہ ان سے دوستانہ تعلقات ہرگز روا نہ رکھیں، اور اگر وہ اپنی روش پر اصرار کریں تو ان سے جنگ بھی کریں۔ بات صرف اتنی تھی کہ وہ (ان حضرات کے تصور کے مطابق) امت اور قوم میں فرق کرتے تھے۔ وہ امت کے اعتبار سے مسلمان رہنا چاہتے تھے لیکن قومیت کے لئے وطن یا نسل کو معیار قرار دیتے تھے۔ یہ وہ شنویت تھی جس کی بنا پر قرآن انہیں مسلمان ہی تسلیم نہیں کرتا تھا۔

یہ ہے معیارِ قومیت کی اہمیت قرآن کی رُو سے جسے آجکل محض ایک سیاسی مسئلہ تصور کر کے درخورِ اہمیت ہی نہیں سمجھا جاتا۔ اب رہا یہ سوال کہ آجکل ساری دنیا کے مسلمانوں نے وطن یا نسل کو معیارِ قومیت قرار دے رکھا ہے۔ دین معیارِ قومیت کہیں نہیں، تو یہ مسلمانوں کا قصور ہے قرآن کا نہیں۔ تحریکِ پاکستان کا مقصود یہ تھا کہ آج جبکہ دنیا میں کہیں بھی اسلام کو معیارِ قومیت نہیں قرار دیا جا رہا، ایک مختصر سے خطۂ زمین ہی میں سہی، ایک ایسی مملکت قائم کی جائے جس کی بنیاد اسلام کے معیارِ قومیت پر ہو اور جس میں تمام فیصلے خدا کی کتاب کے مطابق کئے جا سکیں۔ مقصد یہ تھا کہ یہ مملکت اسلام کے احیاء کے لئے ذرۂ اولیں (FIRST CRYSTAL) کا کام دے۔ جب اسلامی معیارِ قومیت کو یہاں عملاً نافذ کر دیا جائے تو پھر اس تجربہ کو آگے بڑھایا جائے اور رفتہ رفتہ دیگر اسلامی ممالک کو بھی اس راستے پر لایا جائے۔ منتہیٰ اس اسکیم کا یہی تھا کہ پھر سے ساری دنیا کے مسلمان امتِ واحدہ (یعنی ایک قوم) کی حیثیت سے زندگی بسر کریں۔

لیکن وائے بدنصیبی کہ ہم نے ایک مملکت تو حاصل کر لی لیکن زندگی یہاں بھی قرآنی قالب میں نہ ڈھل سکی۔ پہلے لیوں

پر الفاظ تو دو قومی نظریہ کے رہے لیکن عملاً معیارِ قومیت' وطن کا اشتراک ہی رہا۔ پاکستان کی حدود میں بسنے والے مسلم اور غیر مسلم ایمان کے اختلاف و افتراق کی بناء پر' دو قومیں نہیں بلکہ وطن کے اشتراک کی بناء پر ایک ہی قوم تسلیم کئے جاتے ہیں یہ حالت ان کی ہے جو زبان سے ہی سہی' بہرحال) دو قومی نظریہ کے مدعی ہیں۔ جو لوگ تقسیم سے پہلے' وطن کے اشتراک کی بناء پر قومیت کے قائل تھے' یہاں آکر ان کا "کفر" پہلے سے بھی زیادہ متشدد اور اجڈ ہو گیا ہے۔ یعنی وہاں وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک قوم قرار دیتے تھے' لیکن یہاں خود مسلمانوں کو چار قومیتوں میں تقسیم کر رہے ہیں! یا للعجب۔ یعنی ہندوستان میں وطن کے اشتراک کی بناء پر مسلم اور غیر مسلم ایک قوم' اور یہاں اسی اشتراکِ وطن کے باوجود خود مسلمانوں کی چار قومیں! اور اس پر اصرار یہ کہ یہ عین مطابقِ اسلام ہے۔ مطابقِ اسلام تو ایک طرف' یہ تو خود ان کے نظریۂ قومیت کے بھی مطابق نہیں۔ اس نظریہ کے مطابق ایک ملک کے باشندے ایک قوم تو قرار پاتے ہیں۔ اپنی اس روش (چار قومیتوں) کی تائید میں دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ اسلام مسلمانوں کو اُمتِ واحدہ قرار دیتا ہے' واحد قوم نہیں قرار دیتا۔ مسلمان خواہ چار چھوڑ چار سو قوموں میں بھی منقسم ہو جائیں' ان کی اُمت کی وحدت برقرار رہتی ہے۔ ہم سمجھ نہیں سکے کہ یہ امت کی وحدت ہے کیا بلا جو اختلافِ قومیت کے باوجود بدستور قائم رہتی ہے۔ اور اس کا عملی ماحصل کیا ہے؟ قرآن نے کہا تھا کہ اگر ایک مومن کسی دوسرے مومن کو عمداً قتل کر دے تو وہ سیدھا جہنم میں چلا جاتا ہے۔ یہ تھا وحدتِ امت کا عملی نتیجہ۔ اب حالت یہ ہے کہ ایک ملک کے مسلمان دوسرے ملک کے مسلمانوں کا بلا دریغ قتلِ عام کرتے ہیں۔ بلکہ ایک ہی ملک کے مسلمان نسلی' صوبائی' لسانی حتیٰ کہ سیاسی اختلاف کی بناء پر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں' اور اس کے باوجود ان کے امتِ واحدہ ہونے کے "عقیدہ" پر کوئی حرف نہیں آتا۔

یاد رکھئے۔ آج کی اصطلاح میں جو مفہوم لفظ قوم (نیشن) کا ہے' قرآنی اصطلاح میں وہی مفہوم لفظ امت کا ہے جب اسے مسلمانوں کے لئے استعمال کیا جائے۔ وہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک امت (یعنی ایک قوم) قرار دیتا ہے اور جغرافیائی یا نسلی اور لسانی اختلافات ان کے ایک قوم ہونے کے راستے میں حائل نہیں ہوتے۔ اس اعتبار سے امت اور قوم میں فرق کرنا خلافِ اسلام ہے۔ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں مسلمان مختلف ممالک میں آباد تھے۔ ان کی نسلیں بھی الگ الگ تھیں اور زبانیں بھی جدا جدا۔ حتیٰ کہ ان کا "کلچر" بھی ایک دوسرے سے الگ تھا۔ لیکن اس کے باوجود' وہ سب ایک قوم (امت) کے افراد تھے۔ ان کی قومیتیں مختلف نہیں تھیں۔ جو حضرات آجکل جغرافیائی یا نسلی' لسانی یا صوبائی اختلافات کی بناء پر مسلمانوں کو الگ الگ قومیں قرار دیتے ہیں' انہیں اس سے کون روک سکتا ہے۔ لیکن ان کی خدمت میں اتنا تو عرض کیا جا سکتا ہے کہ وہ اتنی اخلاقی جرأت پیدا کریں کہ اپنے اس تصور یا عمل کے متعلق اعتراف کریں کہ یہ خلافِ اسلام ہے۔ کسی نظریہ یا عمل کے خلاف یا مطابقِ اسلام ہونے کے لئے کوئی خارجی معیار ہونا چاہئے اور مسلمان کے لئے وہ معیار کتاب اللہ کے سوا اور کون سا ہو سکتا ہے۔ کتاب اللہ کی رو سے ساری دنیا کے مسلمان ایک قوم ہیں اور ان کی قوم میں کوئی غیر مسلم شامل نہیں ہو سکتا۔ یہ اسلام کے مسلمات میں سے ہے۔

کراچی میں محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

ہر اتوار۔ صبح ½۹ بجے
(بذریعہ ٹیپ)

بمقام:۔ دفتر بزمِ طلوعِ اسلام۔ ۱۲/۱ فردوس مارکیٹ۔ (بالمقابل بس شاپ) پہلی چورنگی ناظم آباد کراچی ۱۸
ٹیلیفون:۔ ۶۱۰۴۶۸

از شاہد عادل

تفہیم القرآن جلد ششم مودودی صاحب پر ایک نظر

اب ہم اپنے سفر کی آخری منزل تک پہنچ گئے ہیں اور مودودی صاحب کی تفسیر "تفہیم القرآن" کی چھٹی اور آخری جلد تبصرے کے لیے پیش نظر ہے۔ اس جلد کی ابتداء سورۃ التحریم سے ہوتی ہے جس میں شریعت اسلامیہ کے ایک بنیادی مسئلہ پر بحث ہے۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ حلال و حرام کی حدود مقرر کرنے کا اختیار کسے حاصل ہے؟ اس سلسلے میں جناب مفسر سورۃ کے دیباچے میں فرماتے ہیں۔

حلال و حرام کی حدود مقرر کرنے کا اختیار

"ایک یہ کہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے حدود مقرر کرنے کے اختیارات قطعی طور پر اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ اور عام انسان تو درکنار، خود اللہ کے نبی کی طرف بھی ان کا کوئی حصہ منتقل نہیں کیا گیا ہے۔ نبی بحیثیت نبی اگر کسی چیز کو حرام یا حلال قرار دے سکتا ہے تو صرف اس صورت میں جبکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اشارہ ہو، قطع نظر اس سے کہ وہ اشارہ قرآن مجید میں نازل ہوا ہو۔ یا وحی خفی کے طور پر کیا گیا ہو۔ لیکن بطور خود اللہ کی مباح کی ہوئی کسی چیز کو حرام کر لینے کا مجاز نبی بھی نہیں ہے۔ کجا کہ کوئی اور شخص ہو سکے" (صفحہ ۱)

پھر سورت کی پہلی آیت يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ (اے نبی تم کیوں اس چیز کو حرام کرتے ہو جو اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہے) کی تفسیر کے ذیل میں لکھتے ہیں:-

"یہ دراصل استفہام نہیں ہے۔ بلکہ ناپسندیدگی کا اظہار ہے یعنی مقصود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دریافت کرنا نہیں ہے کہ آپ نے یہ کام کیوں کیا ہے۔ بلکہ آپ کو اس بات پر متنبہ کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حلال کی ہوئی چیز کو اپنے اوپر حرام کر لینے کا جو فعل آپ سے صادر ہوا ہے وہ اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے۔ اس سے خود بخود یہ مضمون مترشح ہوتا ہے۔ کہ اللہ نے جس چیز کو حلال کیا ہے اسے حرام کرنے کا اختیار کسی کو بھی نہیں ہے۔ حتیٰ کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہ اختیار نہیں رکھتے" (صفحہ ۱۵)

بڑی خوشی کی بات ہے کہ مودودی صاحب نے شریعت اسلامیہ کے اس بنیادی اصول کو تسلیم کر لیا ہے کہ حلال و حرام کی حدود مقرر کرنے کا اختیار صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے کسی دوسرے شخص یہاں تک کہ

انسانوں تک اللہ تعالیٰ کی شریعت پہنچانے والے انبیاء کو بھی یہ اختیار عطا نہیں کیا گیا۔ لیکن وہ وحی خفی کی آڑ میں اس بنیادی اصول کی تنسیخ اس انداز سے کر جاتے ہیں کہ انبیاء تو کجا خود اپنے لئے بھی حلال و حرام کی حدود مقرر کرنے کا اختیار حاصل کر لیتے ہیں۔ پھر بات صرف اصول تک ہی نہیں رہتی بلکہ عملاً ان چیزوں کو حلال قرار دیتے ہیں جنہیں اللہ اور اس کے رسول صلعم واضح الفاظ میں حرام قرار دیتے ہیں۔

حرام کو حلال قرار دینے کی عملی مثال

ہو سکتا ہے کہ قارئین ہمارے اس دعویٰ کو شک کی نظروں سے دیکھیں اور کہیں کہ اتنا بڑا مفسر قرآن، شریعت اسلامیہ کے ایک بنیادی اصول کو تسلیم کر لینے کے بعد اس کی کیسے خلاف ورزی کر سکتا ہے: تو لیجئے ہم ان کے اطمینان کی خاطر ایک ایسی مثال پیش کئے دیتے ہیں، جس کا تعلق کروڑوں انسانوں سے ہے۔ اس بارے میں شاید کسی اہل علم کو اختلاف نہیں کہ شریعت اسلامیہ میں سود سب سے بڑی لعنت ہے اور قرآن حکیم نے اسے انسانیت کے لئے سب سے زیادہ سنگین جرم قرار دیا ہے۔ یہاں تک کہ سودی معاملات کو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ بغاوت قرار دیا ہے۔ اس کی اسی سنگینی کو مدنظر رکھتے ہوئے حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ سود کے احکامات چونکہ آخر میں نازل ہوتے تھے اور حضور صلعم انہیں ہمارے لئے پوری طرح واضح نہ کر سکتے تھے اسلئے سود اور جن چیزوں میں سود کا شبہ ہو وہ سب ترک کر دو۔ (احکام القرآن للجصاص جلد اوّل صفحہ ۵۵۱)

اب سود جیسی حرام چیز کو حلال قرار دیدینا کوئی آسان بات نہیں۔ اسلئے بظاہر تو مودودی صاحب بھی اسے حرام قرار دیتے ہیں بلکہ شرعی احکامات کی تائید میں لمبے چوڑے عقلی دلائل بھی دیتے ہیں ایسے کچھ دلائل ان ہی کی زبانی سن لیجئے:۔

تجارت، صنعت و حرفت اور زراعت میں انسان محنت اور ذہانت صرف کرتا ہے اور اس کا فائدہ لے لیتا ہے۔ مگر سودی کاروبار میں وہ شخص اپنی ضروریات سے زائد مال دیکر بلا کسی محنت و مشقت اور صرف کمال کے، دوسروں کی کمائی میں شریک غالب بن جاتا ہے۔ اس کی حیثیت اصطلاحی شریک کی نہیں ہوتی جو نفع و نقصان دونوں میں شریک ہوتا ہے۔ جو بالحاظ نفع و نقصان اور بالحاظ تناسب نفع اپنے مقرر اور مشروط منافع کا دعویدار ہوتا ہے۔ (سود حصہ اوّل صفحہ ۳۷)

سود کی اس واضح حرمت کو تسلیم کر لینے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے کون کون سے معاملات سود کی تعریف میں آتے ہیں۔ عام طور پر ہمارے اکثر اہل علم اور عامۃ الناس یہ سمجھتے ہیں کہ سود وہ ہے جو بنکوں میں لیا دیا جاتا ہے۔ اور بس۔ حالانکہ حضور صلعم کے زمانے میں ان بنکوں کا رواج تک نہ تھا۔ اور یہ بڑی حیران کن حقیقت ہے کہ جن معاملات کو آپ واضح الفاظ میں سود قرار دے گئے تھے انہیں ہماری مفاد پرستیوں نے حلال وطیب قرار دے دیا۔ اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم صرف ایک ایسے معاملے کی مثال پیش کرتے ہیں اور یہ معاملہ زمین کی بٹائی کا ہے۔ جیسا کہ قارئین جانتے ہوں گے اس معاملے سے مراد یہ ہے کہ زمین کا مالک کوئی اور ہو اور اس زمین پر کام کرنے والا کوئی دوسرا شخص ہو۔ اور فصل کے تیار ہونے پر کام کرنے والا شخص جسے اصطلاح میں

مزارعت کہتے ہیں فصل کا تقریباً نصف مالک زمین کے حوالے کر دے۔ حضور صلعم بٹائی کے اس معاملے کو واضح الفاظ میں سود قرار دیتے ہیں۔ حدیث کی مشہور کتاب سنن ابو داؤد میں کتاب البیوع کی حدیث نمبر ۳۴۰۲ میں حضور صلعم کا یہ ارشاد موجود ہے۔ اور یہی نہیں بلکہ حدیث کے راوی حضرت رافع بن خدیجؓ کو جنہوں نے ایسا معاملہ کر رکھا تھا۔ یہ سودی معاملہ ختم کرنے کا فوری حکم دیا۔ بلکہ اس سے اگلی حدیث نمبر ۳۴۰۶ میں تو آپ نے بٹائی کی حرمت کے لئے وہی سخت الفاظ استعمال کئے ہیں جو قرآن مجید میں سود کی حرمت کیلئے آئے ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

"مَنْ لَمْ یَذَرِ الْمُخَابَرَۃَ فَلْیَأْذَنْ بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ ۔ جو بٹائی کے معاملے کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کے لئے تیار ہو جائے"

امام ابوداؤد نے ان دونوں احادیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ ان صحیح ارشادات نبویؐ سے قطع نظر سود کی حرمت کے بارے میں خود مودودی صاحب کی مذکورہ بالا عقلی تشریح کو سامنے رکھئے تو بھی بٹائی کا معاملہ سودی قرار پاتا ہے یعنی ایک شخص اپنے ضرورت سے زائد سرمایہ کو بنک میں رکھ کر بلا کسی محنت و مشقت کے اس کا فائدہ اٹھاتا ہے یعنی معمولی شرح سے سود حاصل کرتا ہے تو وہ بالاتفاق حرام ہے۔ لیکن اگر وہ اسی زائد سرمایہ کو بنک میں رکھنے کی بجائے زمین کی شکل میں کسی غریب مزارع کو دے دے اور بغیر کسی محنت و مشقت اور صرف کمال کے اس کی سال بھر کی محنت کا نصف، بٹائی کی صورت میں وصول کر لے۔ تو وہ کیونکر اس سود کی تعریف سے خارج ہو جائے گا۔

اب چاہئے تو یہ تھا کہ حضرت عمرؓ کی تصریح کو سامنے رکھتے ہوئے سود تو کیا شبہ سود والی چیزوں سے بھی ہم اپنے آپ کو بچاتے۔ لیکن مودودی صاحب قرآن مجید کے واضح احکام اور حضور صلعم کی واضح ترین تشریحات کو پس پشت ڈالتے ہوئے ڈنکے کی چوٹ، بٹائی کے سودی معاملے کو جائز قرار دیتے ہیں یہی نہیں بلکہ اسے سود قرار دینے والوں کا منہ بند کرنے کیلئے اس کے جواز کے بارے میں ایک پوری کتاب "مسئلہ ملکیت زمین" تصنیف فرما دیتے ہیں۔ اور اس طرح سے حلال و حرام کی حدود مقرر کرنے کے خدائی اختیارات، جو ان کی اپنی تحقیق کے مطابق حضور صلعم تک کو نہیں دیئے جا سکتے تھے، خود اپنے لئے حاصل کر کے اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیز کو حلال قرار دے دیتے ہیں۔

کسی کے راز کے کھوج لگانے کی ممانعت

اسی سورت کی تیسری آیت میں مذکورہ ایک واقعے کے بارے میں بھی وہ عجیب و غریب طرزِ عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ آیت کے الفاظ یہ ہیں:-

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِہٖ حَدِیْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِہٖ وَاَظْہَرَہُ اللّٰہُ عَلَیْہِ عَرَّفَ بَعْضَہٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَہَا بِہٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَکَ ہٰذَا ۭ قَالَ نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ ۔

(ترجمہ) اور یہ معاملہ بھی قابل توجہ ہے کہ نبی نے ایک بات اپنی بیوی سے راز میں کہی تھی۔ پھر جب اس بیوی نے (کسی اور سے) وہ راز ظاہر کر دیا اور اللہ نے نبی کو اس کی اطلاع

دے دی تو نبی نے کسی حد تک اسے خبردار کیا اور کسی حد تک اس سے درگزر کیا۔ پھر جب نبی نے اُسے (افشائے راز کی) یہ بات بتائی تو اس نے پوچھا آپ کو اسکی خبر کس نے دی۔ آپ نے فرمایا مجھے اس نے خبر دی جو سب کچھ جانتا ہے اور خوب باخبر ہے۔

اس آیت کی سادہ سی تشریح فرماتے ہوئے صاحبِ تفسیر ایک عمدہ اصول کی طرف بھی اشارہ کر جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

> مختلف روایات میں مختلف باتوں کے متعلق یہ بیان کیا گیا ہے کہ فلاں بات تھی جو حضورؐ نے اپنی ایک بیوی سے راز میں کہی تھی اور اُن بیوی نے ایک دوسری بیوی سے اُسکا ذکر کر دیا۔ لیکن ہمارے نزدیک اوّل تو اس کا کھوج لگانا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ راز کے افشا کرنے پر ہی تو اللہ تعالیٰ یہاں ایک بیوی کو ٹوک رہا ہے۔ پھر ہمارے لئے کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ ہم اس کی ٹٹول کریں اور اسے کھولنے کی فکر میں لگ جائیں۔ دوسرے جس مقصد کے لئے یہ آیت نازل ہوئی ہے اس کے لحاظ سے یہ سوال سرے سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ وہ راز کی بات تھی کیا۔ مقصدِ کلام سے اس کا کوئی تعلق ہوتا تو اللہ تعالیٰ اسے خود بیان فرما دیتا۔ (صلا)

فاضل مفسر نے اس بارے میں بہت سی لمبی چوڑی احادیث کہ جن میں امہات المومنینؓ کی نسبت عجیب عجیب باتیں منسوب کی گئی ہیں کو رد کرتے ہوئے جس سادگی سے قرآن مجید کی اس آیت کی تفسیر فرمائی ہے ہم اسے قابلِ تحسین سمجھتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ دوسرے مقامات پر بھی اسی سادگی پر عمل فرماتے جس کے کئی فوائد ہوتے۔ سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ ان کی تفسیر اپنے موجودہ حجم سے نصف ہوتی اور نادار اور متوسط طبقہ کے لوگ بھی اسے خرید سکتے۔ دوسرے سادہ تفسیر کی وجہ سے قرآن مجید کا سمجھنا بھی آسان ہوتا۔ لیکن جیسا کہ ان کا معمول ہے وہ ایک ہی سانس میں کسی اصول کا اعلان کرتے ہیں اور دوسرے سانس میں اس کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیتے ہیں۔ تو اس واقعے کے بارے میں بھی انہوں نے ٹھیک ٹھیک اپنے اسی معمول پر عمل کیا ہے۔ بلکہ اس سے بھی دو چار قدم آگے نکل جاتے ہیں اور بعض دوسری امہات المومنینؓ کے بارے میں نہ صرف ایسی عجیب وغریب تمام تفصیلات نقل کرتے ہیں۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے بیان نہیں فرمایا۔ بلکہ ان پر نعوذ باللہ زبان درازی کا الزام بھی لگاتے ہیں۔

اُمہات المومنینؓ کی زبان درازی پر مودودی صاحب کا اصرار

چنانچہ اسی واقعہ کے بارے میں اگلی آیت اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا۔ (اگر تم دونوں اللہ سے توبہ کرتی ہو۔ (تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے) کیونکہ تمہارے دل سیدھی راہ سے ہٹ گئے) کی تفسیر میں اپنے مذکورہ بالا اصول کے بخیئے ادھیڑ دیتے ہیں۔ حالانکہ انہوں نے اس آیت کا جو ترجمہ کیا تھا وہ خود اپنی آپ تشریح تھا۔ لیکن چونکہ یہاں معاملہ کچھ دوسری امہات المومنینؓ کی طرف منسوب تھا۔ اس لئے پچھلی آیت میں اپنے قائم کردہ اصول پر صبر

ذکر کے اور ایسی ایسی تفصیلات سے تفہیم القرآن کے تین صفحے بھر دیئے جن کا آیت زیرِ تفسیر سے بظاہر کوئی تعلق تک نہیں بنتا۔ معاملہ اگر ان عجیب وغریب تفصیلات کے نقل کر دینے تک محدود رہتا تو بھی خیر تھی۔ لیکن مودودی صاحب تو چند قدم آگے بڑھ کر ام المومنین حضرت عائشہؓ اور ام المومنین حضرت حفصہؓ کو (معاذ اللہ) زبان دراز ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اس آیت کی تفصیل ہمیں حدیث میں ملتی ہے اور پھر حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی زبانی ایک طول طویل روایت نقل کرتے ہیں۔ اختصار کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اس ساری روایت کا نقل کرنا تو ہمارے لئے ممکن نہیں تاہم قارئین کی خدمت میں اس کا کچھ حصہ پیش کیا جاتا ہے

حضرت ابن عباس کی روایت ہے۔

"میں ایک مدت سے اس فکر میں تھا کہ حضرت عمرؓ سے پوچھوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں میں سے وہ کون سی دو بیویاں تھیں جنہوں نے حضورؐ کے مقابلے میں جتھہ بندی کر لی تھی" اور جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ آیت ارشاد فرمائی ہے۔ لیکن ان کی ہیبت کی وجہ سے میری ہمت نہ پڑتی تھی۔ آخر ایک مرتبہ وہ حج کیلئے تشریف لے گئے اور میں ان کے ساتھ گیا۔ واپسی پر راستہ میں ایک جگہ اُن کو وضو کراتے ہوئے مجھے موقع مل گیا اور میں نے یہ سوال پوچھ لیا۔ انہوں نے جواب دیا وہ عائشہؓ اور حفصہؓ تھیں پھر انہوں نے بیان کرنا شروع کیا کہ ہم قریش کے لوگ اپنی عورتوں کو دبا کر رکھنے کے عادی تھے، جب ہم مدینہ آئے تو ہمیں یہاں ایسے لوگ ملے جن پر ان کی بیویاں حاوی تھیں اور یہی سبق ہماری عورتیں بھی اُن سے سیکھنے لگیں۔ ایک روز میں اپنی بیوی پر ناراض ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ مجھے پلٹ کر جواب دے رہی ہیں (اصل الفاظ ہیں فَاِذَا هِیَ تُرَاجِعُنِیْ) مجھے یہ بہت ناگوار ہوا کہ وہ مجھے پلٹ کر جواب دے۔ اس نے کہا آپ اس بات پر کیوں بگڑتے ہیں کہ میں آپ کو پلٹ کر جواب دوں۔ خدا کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں حضورؐ کو دُو بدو جواب دیتی ہیں (اصل لفظ ہے لَیُرَاجِعْنَهٗ) اور ان میں سے کوئی حضورؐ سے دن دن بھر روٹھی رہتی ہے (بخاری کی روایت میں ہے کہ حضورؐ اس سے دن بھر ناراض رہتے ہیں) یہ سن کر میں گھر سے نکلا اور حفصہؓ کے ہاں گیا (جو حضرت عمرؓ کی بیٹی اور حضورؐ کی بیوی تھیں) میں نے اس سے پوچھا کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو بدو جواب دیتی ہے؟ اس نے کہا ہاں۔ میں نے پوچھا اور کیا تم میں سے کوئی دن دن بھر حضورؐ سے روٹھی رہتی ہے؟ (بخاری کی روایت ہے کہ حضورؐ دن بھر اس سے ناراض رہتے ہیں) اس نے کہا ہاں۔ میں نے کہا نامراد ہوگئی اور گھاٹے میں پڑ گئی وہ عورت جو تم میں سے ایسا کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کبھی زبان درازی نہ کر (یہاں بھی وہی الفاظ ہیں لَا تُرَاجِعِیْ) (ص ۲۳-۲۴)

اس حدیث کو اگر سامنے رکھا جائے تو پھر اسلامی تعلیمات کچھ یوں بنتی ہیں کہ اسلام میں کسی عورت کو اپنے مرد کی باتوں پر جواب دینے کا حق ہی نہیں، چاہے وہ اس بات کو اپنے لئے پسند کرے یا نہ کرے اسے ہر حال میں اسے برداشت کرنا ہی ہوگا۔ قرآن وحدیث سے مجھے کوئی ایسا

حکم نہیں مل سکا جو اس نقطۂ نظر کی تائید کرے۔ اس لئے بجز حدیث احادیث القدسی یعنی وہ احادیث جن میں پیچیدہ قصے بیان ہوئے ہیں کو عام احادیث کی طرح مستند نہیں سمجھتے۔ دوسری بات جو اس حدیث میں کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ کا ایک معتد بہ حصہ ہمیں ام المومنین حضرت عائشہؓ کی معرفت ملا۔ اور اس حدیث سے تو یہ ثابت ہے کہ نعوذ باللہ خود انہیں اپنے خاوند (جو اللہ کے رسول بھی تھے) سے بات کرنے کا بھی سلیقہ نہ تھا۔ یہاں تک کہ وہ ان پر زبان درازی سے بھی دریغ نہیں کرتی تھیں۔ یہ ایک ایسی تلخ بات تھی کہ خود مودودی صاحب کے درباری کہ جو ان کی ہر صحیح و غلط بات پر آمنّا و صدّقنا کہنے کے عادی ہیں۔ وہ بھی چیخ اٹھے۔ کیونکہ قطع نظر اس سے کہ یہ حدیث صحیح ہے یا ضعیف اس میں ایسا کوئی لفظ یا الفاظ نہیں جن کے معنی زبان درازی کے لئے جا سکیں۔ جیسا کہ قارئین جانتے ہوں گے۔ مودودی صاحب کی یہ تفسیر کتابی صورت میں شائع ہونے سے پہلے ان کے رسالے ترجمان القرآن میں قسط وار شائع ہوتی رہی ہے۔ چنانچہ اس قسط کے شائع ہونے پر مودودی صاحب کے اپنے حلقے کے لوگوں نے اعتراض کیا کہ معاملہ امہات المومنینؓ کا ہے اور خود حدیث میں بھی ایسا کوئی لفظ نہیں جن سے ان پاکیزہ ہستیوں پر زبان درازی کا الزام لگایا جا سکے۔ اور اگر بالفرض ایسا کوئی لفظ ہوتا بھی تو ہمیں ان کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے اس کی ترجمانی زیادہ شریفانہ الفاظ میں کرنی چاہیے تھی۔ یہ اعتراض ہر شریف آدمی کے دل کی آواز تھی۔ لیکن مودودی صاحب اگر اپنی غلطی تسلیم کر لیں تو پھر وہ مودودی صاحب ہی کیا ہوئے۔ اس لئے اس اعتراض کا جو جواب انہوں نے دیا وہ بھی انہی کی زبانی سن لیجئے فرماتے ہیں:-

عذرِ گناہ بدتر از گناہ

"اس ترجمے کو بعض لوگ غلط کہتے ہیں اور ان کا اعتراض یہ ہے کہ مراجعت کا ترجمہ پلٹ کر جواب دینا یا دو بدو جواب دینا تو صحیح ہے مگر اس کا ترجمہ "زبان درازی" صحیح نہیں ہے۔ لیکن یہ معترض حضرات اس بات کو نہیں سمجھتے کہ اگر کم رتبے کا آدمی اپنے سے بڑے آدمی کو پلٹ کر جواب دے یا دوبدو جواب دے تو اسی کا نام زبان درازی ہے۔ مثلاً باپ اگر بیٹے کو کسی بات پر ڈانٹے یا اس کے کسی فعل پر ناراضی کا اظہار کرے اور بیٹا اس پر ادب سے خاموش رہنے یا معذرت کرنے کے بجائے پلٹ کر جواب دینے پر اتر آئے تو اس کو زبان درازی کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ پھر جب معاملہ باپ اور بیٹے کے درمیان نہیں بلکہ اللہ کے رسول اور امت کے کسی فرد کے درمیان ہو تو صرف ایک غبی آدمی ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کا نام زبان درازی نہیں ہے" (صفحہ ۲۵)

کہاں اسی واقعے کے پہلے حصے کے بارے میں یہ فرمانا کہ ہمارے لئے کسی ایسی بات کا کھوج لگانا مناسب نہیں جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بیان نہیں فرمایا اور کہاں اسی واقعے کے دوسرے حصے کے بارے میں ان کا یہ طرزِ عمل کہ اللہ تعالیٰ نے تو قرآن مجید میں کچھ نہیں بتایا لیکن ہم (یعنی مودودی صاحب) امہات المومنین پر زبان درازی کا صرف الزام ہی نہیں لگا دیں گے بلکہ اس پر اصرار بھی کریں گے حالانکہ خود حدیث کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اہم واقعے کے بارے میں حضور صلعم کے عہد میں وہ صحابہ کرامؓ بھی کچھ نہیں جانتے تھے جو ہر وقت آپ کے قریب رہتے

تھے۔ یہاں تک کہ اس حدیث کے راوی حضرت عبداللہ بن عباس جنہیں حضورؐ کی قربت میں رہنے کی وجہ سے مفسر القرآن کا درجہ دیا گیا تھا وہ بھی اس سے ناواقف تھے اور انہوں نے حضورؐ صلعم کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ سے اس کی تفصیلات دریافت کیں۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ جب صحابہ کرام کے جن کی آنکھوں کے سامنے یہ واقعہ ہوا تھا کو حضور صلعم نے اس بارے میں ایک لفظ تک نہ بتایا۔ تو کیا یہ ضروری تھا کہ چودہ سو سال بعد اسکی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کو مودودی صاحب کی تفہیم القرآن کی زینت بنایا جاتا؟

اللہ تعالیٰ کے آسمان پر ہونے کا مطلب

سورت الملک کی آیت ءَأَمِنتُم مَّن فِي السَّمَاءِ (کیا تم اس سے بے خوف ہو کہ وہ جو آسمان میں ہے) کو سامنے رکھتے ہوئے ہمارے اکثر علمائے کرام اصرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آسمان پر رہتا ہے اور پھر عرش اور آسمان پر خدائی دربار کی ایسی ایسی تفصیلات بیان کی جاتی ہیں جیسا کہ دنیا میں بڑے بڑے بادشاہوں کے ہاں پائی جاتی تھیں۔ پھر ان تفصیلات کو سامنے رکھتے ہوئے معراج نبویؐ کے بارے میں اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب تفصیلات کا اضافہ کیا جاتا ہے بعض صورتوں میں یہ تصور اتنا پختہ ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کا ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہونے اور ہماری شہ رگ کے قریب ہونے کا صحیح اسلامی تصور اس میں گم ہو کر رہ گیا۔ اس طرح عقیدہ توحید جو اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے، کو بے حیثیت بنا دیا گیا۔ خوشی کی بات ہے کہ مودودی صاحب اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی آیت کی تفسیر کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں رہتا ہے۔ بلکہ یہ بات اس لحاظ سے فرمائی گئی ہے کہ انسان فطری طور پر جب خدا سے رجوع کرنا چاہتا ہے تو آسمان کی طرف دیکھتا ہے" (صفحہ ۵۴)

جزاک اللہ اس ایک فقرے سے صاحب تفسیر نے ہمارے واعظوں کی اس شیریں بیانی کو ختم کر دیا ہے کہ جو معلوم نہیں بیچارے عامۃ الناس کو کہاں لے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مودودی صاحب معراج نبویؐ کے سلسلہ میں وہ سب قصے بیان کرتے ہیں جن سے واعظ داستان سرائی فرماتے ہیں۔

مقام حدیث اور اسکی صحت کا معیار

مودودی صاحب جس خوبصورتی سے صحیح احادیث کا انکار کر کے اپنی تحقیقات کی بنیادیں جھوٹی احادیث پر اٹھاتے ہیں اس کی کچھ جھلکیاں تفہیم القرآن کی پچھلی جلدوں کے تبصروں اور اس تبصرے کے پہلے عنوان میں قارئین کی نظروں سے گزر چکی ہیں۔ اس جلد میں ایک دفعہ پھر وہ اس بحث کو اٹھاتے ہیں۔ اور مقام حدیث اور اس کی صحت کے معیار کے بارے میں پہلے سے بھی زیادہ مضبوط دلائل دیتے ہیں۔ سورت القیامۃ کی آیت ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ (پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ذمہ ہے) کی تفسیر کے ذیل میں فرماتے ہیں:-

اس کے بعد کوئی ایسا آدمی جو قرآن کو مانتا ہو اس بات کو تسلیم کرنے سے کیسے انکار کر سکتا ہے کہ قرآن کی صحیح و مستند، بلکہ فی الحقیقت سرکاری تشریح صرف وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول اور عمل سے فرما دی ہے۔ کیونکہ وہ آپ کی ذاتی تشریح نہیں ہے۔ بلکہ خود قرآن کے نازل کرنے والے خدا کی بتائی ہوئی تشریح ہے۔ اس کو چھوڑ کر یا اس سے ہٹ کر جو شخص بھی قرآن کی کسی آیت یا اسکے

کسی لفظ کا کوئی من مانا مفہوم بیان کرتا ہے وہ ایسی جسارت کرتا ہے جس کا ارتکاب کوئی صاحبِ ایمان آدمی نہیں کر سکتا۔" (صفحہ ۱۷)

شریعتِ اسلامیہ میں سب سے سنگین جرم یعنی سود کے بارے میں متفقہ کی قومی اور عملی تشریح کو جس طرح مودودی صاحب نے اپنا من مانا مفہوم پہنا کر اسے جائز قرار دیا ہے۔ اس کی مثال ہم پہلے عنوان کے تحت دے چکے ہیں۔ جس کے بارے میں قارئین خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ خود مودودی صاحب کی تصریح کے مطابق ایسی جسارت کے ارتکاب کرنے والے کی ایمانی کیفیت کیا ہو گی۔

حدیث کا مقام متعین کرنے کے بعد اگلے صفحہ پر اس کی صحت کے اصول بیان فرماتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے:-

"پھر ایسی بات کہنے والوں کو شاید یہ معلوم نہیں ہے کہ اس امت نے اول روز سے اس بات کا اہتمام کیا تھا کہ جس ذاتِ پاک کے اقوال و افعال قانون کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ ہونے پائے۔ اور جتنا جتنا غلط باتوں کے اس ذات کی طرف منسوب ہونے کا خطرہ بڑھتا گیا۔ اتنا ہی زیادہ اس امت کے خیر خواہ اس بات کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرتے چلے گئے کہ صحیح کو غلط سے تمیز کیا جائے۔ صحیح و غلط روایات کی تمیز کا یہ علم ایک بڑا عظیم الشان علم ہے جو مسلمانوں کے سوا دنیا کی کسی قوم نے آج تک ایجاد نہیں کیا ہے۔ سخت بدنصیب ہیں وہ لوگ جو اس علم کو حاصل کئے بغیر مغربی مستشرقین کے بہکائے میں آ کر حدیث و سنت کو۔ قابلِ اعتراض ٹھہراتے ہیں اور نہیں جانتے کہ اپنی اس جاہلانہ جسارت سے وہ اسلام کو کتنا بڑا نقصان پہنچا رہے ہیں۔" (صفحہ ۱۸)

جھوٹی احادیث مودودی صاحب کے سچے موتی ہیں

مودودی صاحب کی اس تحریر کو پڑھ کر تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ حدیث و سنت کے پروانے ہیں۔ حالانکہ ان کی اس تحریر کا مقصد اپنے بعض مخالفین پر کیچڑ اچھالنا ہے۔ جن حضرات نے مودودی صاحب کی کتابیں مطالعہ کی ہیں وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ جس طرح مذکورہ بالا اصول کی مودودی صاحب نے مٹی پلید کی ہے۔ ساری اسلامی تاریخ میں ایسی جسارت کسی سے نہ ہو سکی۔ اپنی ان تصنیفات میں وہ علی الاعلان صحیح احادیث کا انکار کر دیتے ہیں اور ان کے مقابلے میں اکثر حدیث کے مذکورہ بالا اصول کے مطابق جھوٹی احادیث کو "سچے موتی" قرار دے کر اپنے مطلب کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ حدیث حضرات نے آپ پر "منکرِ حدیث" ہونے کا فتویٰ لگایا۔ لیکن ان کی چالاکی ملاحظہ ہو کہ وہ مذکورہ بالا تحریروں کے ذریعے، اس فتویٰ کا رخ تو دوسری طرف پھیر دیتے ہیں۔ اور عامۃ الناس کے سامنے اپنے انکارِ حدیث کے مسلک کو چھپانے کے لئے احادیث کو پرکھنے کا ایک نیا معیار قائم کرتے ہیں۔ اس معیار کے مطابق مسلمانوں کے روایات میں تمیز کرنے کے شاندار علم کی حیثیت ایک کوڑی سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ کیونکہ اس کی بنیاد کسی علمی تحقیق پر نہیں بلکہ صرف مودودی صاحب کے وجدان پر ہے۔ احادیث کی صحت کے معیار کے بارے میں یہ نیا اصول خود انہی کی زبانی سنئیے:-

نبی اکرم کا مزاج شناس

"وہ جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے اور جس نے کثرت کے ساتھ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا ہے۔ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت اُسے بتا دیتی ہے کہ ان میں سے کون سا قول میرے سرکار کا ہو سکتا ہے۔ اور کونسی چیز سنتِ نبوی سے اقرب ہے یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اس کو قرآن و سنت سے کوئی چیز نہیں ملتی ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔ یہ اس لئے کہ اس کی روح روحِ محمدی میں گم اور اس کی نظر بصیرتِ نبویؐ کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے۔ اس کا دماغ اسلام کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ اور وہ اس طرح دیکھتا اور سوچتا ہے جس طرح اسلام چاہتا ہے کہ دیکھا اور سوچا جائے۔ اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد انسان اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے۔ مگر اس کے فیصلے کا دار و مدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی نظر اس افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت دیکھ لیتی ہے اور بسا اوقات وہ ایک غیر معتل، غیر شاذ، متصل السند مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس کے جام زریں میں جو بادہ معنی بھری ہوئی ہے۔ وہ اسے طبیعتِ اسلام اور مزاجِ نبویؐ کے مناسب نظر نہیں آتی۔" (تفہیمات از مولانا مودودی صاحب جلد اوّل صہ ۲۹۶)

مودودی صاحب کے حلقے میں اہلِ علم کی کمی نہیں۔ وہ خود ایمانداری سے اس امر کا فیصلہ فرما دیں کہ مودودی صاحب کے صحتِ حدیث کے بارے میں قائم کردہ اس نئے اصول کے بعد مسلمانوں کے ایجاد کردہ عظیم علم اسماء الرجال کہ جس میں لاکھوں راویوں کے حالاتِ زندگی جمع کئے گئے ہیں اور صحتِ حدیث کے دوسرے علمی معیاروں کی حیثیت کھوٹے سکے سے بھی کم رہ جاتی ہے یا نہیں۔ اور یہ کہ اگر ان کے تفہیم القرآن والے اصول کو صحیح سمجھا جائے تو ان کا تفہیمات والا اصول صحتِ احادیث کا نہیں بلکہ انکارِ حدیث سے بھی زیادہ سنگین جسارت ہے۔ کیونکہ اس میں نہ صرف یہ کہ صحیح احادیث کا انکار کر دیا جاتا ہے۔ بلکہ ان کے مقابلے میں جھوٹی احادیث کو موتی قرار دیکر انہیں اپنے مطلب کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

جنت میں شراب کی موجودگی پر اصرار

مودودی صاحب کی تفسیر کا بار بار مطالعہ کرنے کے باوجود یہ راز مجھ پر ابھی تک نہیں کھل سکا کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی کسی مشروبِ جنت کا ذکر آیا ہے۔ وہ اس سے شراب کیوں مراد لیتے ہیں؟ تفہیم القرآن جلد چہارم میں جو انہوں نے لفظ "کاس" کے استعمال سے استدلال کیا تھا، کہ عربی زبان میں لفظ کاس بول کر ہمیشہ شراب مراد لی جاتی ہے۔ (صہ ۲۹۶) تو ہم نے عربی ادب سے یہ ثابت کر دیا تھا۔ کہ کاس کا لفظ دوسرے معانی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر کی زیرِ تبصرہ جلد میں بھی چار مقامات پر مشروباتِ جنت کا ذکر آیا ہے۔ جہاں کوئی ایسا لفظ نہیں جس کا ترجمہ شراب کیا جا سکے۔ لیکن مودودی صاحب حسبِ معمول ہر جگہ شراب کا لفظ اپنی جا:

ہیں۔ مثلاً سورت الدھر کی آیت اِنَّ الْاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ مِنْ کَاْسٍ کَانَ مِزَاجُهَا کَافُوْرًا۔ کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:۔

"نیک لوگ جنت میں شراب کے ایسے ساغر پئیں گے جن میں آبِ کافور کی آمیزش ہوگی" یہاں بھی جناب مفسر کاْس کے لفظ کی وجہ سے مشروبِ جنت کو "شراب" قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ ہم عربی ادب سے ثابت کر چکے ہیں کہ کاْس دوسرے مقاصد کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ مودودی صاحب قرآن مجید کی تفسیر لکھنے سے پہلے عربی ادب کا بھی کچھ مطالعہ کر لیتے۔ پھر اسی صورت کی سترھویں آیت میں وَ یُسْقَوْنَ فِیْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِیْلًا۔ کا ترجمہ کرتے ہیں " ان کو وہاں ایسی شراب کے جام پلائے جائیں گے جس میں سونٹھ کی آمیزش ہوگی"

عموماً تفہیم القرآن میں ترجمے کی وضاحت کے لئے جب مودودی صاحب کسی لفظ یا الفاظ کا اضافہ کرتے ہیں۔ تو انہیں خطوط وحدانی میں لکھتے ہیں لیکن جب شراب کے لفظ کا اضافہ کرتے ہیں تو کسی خطوط وحدانی کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ تیسرا مقام سورۃ النباء کی ۳۴ آیت ہے اور اس میں بھی کاْس کا لفظ ہے۔ لیکن سورۃ المُطَفِّفِیْن کی پچیسویں آیت میں تو کاْس کا لفظ بھی نہیں، لیکن پھر بھی ترجمے میں حسبِ معمول شراب کے الفاظ موجود ہیں۔ آیت یوں ہے۔ یُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِیْقٍ مَّخْتُوْمٍ جس کا ترجمہ نفیس ترین سربند شراب کرتے ہیں۔ عربی میں مختوم کے معنی تو سربند کے ہیں اور رحیق کے معنی خوشبودار چیز کے ہیں اور یہاں زیادہ سے زیادہ اس سے مراد خوشبودار مشروب کے ہو سکتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ نفیس ترین اور شراب کے الفاظ کونسے قرآنی الفاظ کا ترجمہ ہیں۔ کیونکہ رحیق کے دوسرے معنی خالص کے ہیں۔ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ رحیق کے مادے سے ایک دوسرے لفظ "رحق" کے معنی شراب کے ہیں۔ اگرچہ ان دونوں یعنی رحق اور رحیق کی جمع ایک ہی یعنی الرحاق ہے۔ لیکن ان کے معانی میں جو زمین و آسمان کا فرق ہے اسے تو ایک عام آدمی بھی پہلی نظر میں محسوس کر لیتا ہے۔ کجا اتنے بڑے مفسر اس فرق کو نظر انداز کر جائیں۔

نذر کی شرعی حیثیت

نذر ماننے کے بارے میں ہم تفہیم القرآن جلد اوّل کے تبصرے میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت سے حضور صلعم کا یہ ارشاد نقل کر آئے ہیں کہ آپ نے ہر قسم کی نذر ماننے سے منع فرما دیا تھا تاہم جو نذر مانے وہ اسے پورا ضرور کرے۔ (بحوالہ نیل الاوطار از علامہ شوکانی جلد ۸ صفحہ ۲۴۹) لیکن چونکہ اسی جلد میں مودودی صاحب نذر ماننے کی اللہ تعالٰے کی اطاعت اور اس کے پورا کرنے کو اجر و ثواب کا موجب قرار دیتے ہیں (صفحہ ۲۰۸) تو انہیں حضور صلعم کے مقابلے میں اپنی بات کا بھرم رکھنے کے لئے تفہیم القرآن کی اس جلد کے پورے چھ صفحات سیاہ کرنے پڑے۔ یہاں وہ مذکورہ بالا ارشاد نبوی کو چھوڑ کر یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ (یہ وہ لوگ ہوں گے جو (دنیا میں) نذر پوری کرتے ہیں) کی تفسیر میں فقہا کے مختلف اقوال کا سہارا لیتے ہیں کہ انہوں نے نذر کی چار قسمیں بیان کی ہیں اور پھر ان کی مختلف تفصیلات ہیں وغیرہ وغیرہ (صفحہ ۱۸۱)

اگر مودودی صاحب اپنے اس اصول کے جسے ہم مقام حدیث کے عنوان کے تحت نقل کر آئے ہیں، کہ حضور صلعم کے قول و فعل "وحی خفی" کا درجہ رکھتے ہیں، کا ذرہ بھر بھی خیال ہوتا تو وہ نذر کے بارے میں حضور صلعم کا زبانی سا فرمان تسلیم کر لیتے اور فقہاء کی لمبی چوڑی تفصیلات نقل کر کے خواہ مخواہ اپنی تفسیر کا حجم نہ بڑھاتے۔

کوئی انسان اپنی تقدیر سے بال برابر نہیں ہٹ سکتا

مسئلہ تقدیر کو ہمارے ہاں بڑے پیچیدہ مسائل میں سے شمار کیا جاتا ہے۔ دیکھئے مودودی صاحب اسے کس طرح حل فرماتے ہیں۔ سورت عَبَسَ کی آیت خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ (اللہ نے (انسان) کو پیدا کیا پھر اس کی تقدیر مقرر کی) کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"یعنی یہ ابھی ماں کے پیٹ ہی میں بن رہا تھا کہ اس کی تقدیر طے کر دی گئی۔ اس کی جنس کیا ہوگی۔ اس کا رنگ کیا ہوگا۔ اس کا قد کتنا ہوگا۔ اس کی جسامت کیسی اور کس قدر ہوگی۔ اس کے اعضاء کس حد تک صحیح و سالم اور کس حد تک ناقص ہوں گے۔ اس کی شکل صورت اور آواز کیسی ہوگی۔ اس کے جسم کی طاقت کتنی ہوگی۔ اس کے ذہن کی صلاحیتیں کیا ہوں گی۔ کس سرزمین، کس خاندان، کن حالات اور کس ماحول میں یہ پیدا ہوگا، پرورش اور تربیت پائے گا اور کیا بن کر اٹھے گا۔ اس کی شخصیت کی تعمیر میں موروثی اثرات، ماحول کے اثرات اور اس کی اپنی خودی کا کیا اور کتنا اثر ہوگا۔ کیا کردار یہ دنیا کی زندگی میں ادا کرے گا۔ اور کتنا وقت اسے زمین پر کام کرنے کے لئے دیا جائے گا۔ اس تقدیر سے یہ بال برابر بھی ہٹ نہیں سکتا۔ نہ اس میں ذرہ برابر ردّ و بدل کر سکتا ہے" (صـ ۲۵۷)

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان کی زندگی کا سارا کردار اس کی ماں کے پیٹ ہی میں طے کر دیا جاتا ہے جس میں وہ ذرہ برابر ردّ و بدل نہیں کر سکتا۔ اور اپنی زندگی کے بنانے یا بگاڑنے میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں تو پھر نیک اور صالح بننے میں اس کا کیا کمال ہے؟ اور بدکار بن جانے میں اس کا کیا قصور جس کی سزا میں اسے جہنم رسید کر دیا جاتا ہے۔

لیلۃ القدر کے بارے میں چالیس اقوال

سورۃ القدر کی پہلی آیت اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ (ہم نے اس قرآن کو شب قدر میں نازل کیا ہے) سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ جس رات کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے وہ بہت ہی اہم اور مشہور ہوگی۔ اور نزولِ قرآن کے وقت تمام صحابہ کرامؓ اسے جانتے ہوں گے اور حضور صلعم نے وحی خفی کے ذریعے اس کی تعیین کر دی ہوگی۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلعم نے اس مشہور رات کی تعیین تو ضرور فرما دی۔ لیکن اس کے باوجود دورِ رسالت کے اس مشہور ترین واقعے کے بارے میں چالیس مختلف اقوال ہیں۔ چنانچہ مودودی صاحب اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں تسلیم فرماتے ہیں:۔

> اب رہا یہ سوال کہ یہ کونسی رات تھی تو اس میں اتنا اختلاف ہوا ہے کہ قریب قریب چالیس مختلف اقوال اس کے بارے میں ملتے ہیں۔ لیکن علماء امت کی بڑی اکثریت یہ رائے رکھتی ہے کہ رمضان کی آخری دس تاریخوں میں سے کوئی ایک طاق رات شبِ قدر ہے (صـ ۴۰۵)

اس معاملے میں جو "معتبر روایات" مودودی صاحب نے نقل کی ہیں اختصار کے پیشِ نظر ان سب کا نقل کرنا تو ممکن نہیں ہم ان میں سے معتبر ترین روایت جو حضرت ابوبکرہؓ سے منقول ہے نقل کرتے ہیں کہ جس میں آپ روایت فرماتے ہیں کہ "۹ دن باقی ہوں، یا سات دن، یا پانچ دن، یا تین دن یا آخری رات مراد یہ تھی کہ ان تاریخوں میں لیلۃ القدر کو تلاش کرو" (ایضاً)

مقام حدیث کے عنوان کے تحت ہم مودودی صاحب کا یہ قول نقل کر آئے ہیں کہ قرآن کی تشریح کے بارے میں حضور صلعم نے جو کچھ فرمایا وہ وحی خفی تھا اور خود اللہ تعالیٰ کی جانب سے تھا۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس بات کا تعین ضروری تھا تو اللہ تعالیٰ کے ایک دو الفاظ میں اس کی تعیین میں کونسی رکاوٹ تھی کہ اس کے لئے ایک دوسرا طریقہ جسے مودودی صاحبؒ "وحی خفی" قرار دیتے ہیں اختیار کیا۔ اور پھر اس طریقے کے ذریعے بھی اس بات کے بارے میں مختلف چالیس اقوال حضور صلعم کی زبانی روایت کراتے یہاں تک کہ ابھی تک امت، اس ایک بات کا تعین نہیں کر سکی۔ اب اگر کوئی شخص ان چالیس اقوال میں سے ایک کو ترجیح دیتا ہے تو کیا بقیہ ۳۹ اقوال کو ترک کر دینے سے وہ مودودی صاحب کے فتوے کے مطابق صاحب ایمان رہے گا یا نہیں؟

قرآن حکیم میں سرمایہ داروں کی مذمت

سورۃ الھمزۃ میں سرمایہ داروں کی جو سخت مذمت فرمائی گئی ہے وہ کسی تشریح کی محتاج نہیں۔ جہاں تک ان آیات کے ترجمے کا تعلق ہے، مودودی صاحب سرمایہ داری کے جواز کے قائل ہونے کے باوجود اس میں کوئی ڈنڈی نہیں مارتے، فرماتے ہیں "تباہی ہے ہر اس شخص کے لئے جو لوگوں پر طعن اور برائیاں کرنے کا خوگر ہے۔ جس نے مال جمع کیا اور اُسے گن گن کر رکھا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا۔ ہرگز نہیں وہ شخص تو چکنا چور کر دینے والی جگہ میں پھینک دیا جائے گا اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ چکنا چور کر دینے والی جگہ۔ اللہ کی آگ، خوب بھڑکائی ہوئی۔ جو دلوں تک پہنچے گی وہ ان پر ڈھانک کر بند کر دی جائے گی اس حالت میں کہ وہ اونچے اونچے ستونوں میں گھرے ہوئے ہوں گے" (ص ۴۹۵) سرمایہ داروں اور سرمایہ داری کی مذمت میں قرآن مجید کے ان سخت وعیدوں کو پڑھنے کے بعد کوئی ہوشمند انسان سرمایہ داری کا نام لینے کی بھی جرأت نہیں کرے گا۔ لیکن مودودی صاحب کی مصیبت یہ ہے کہ وہ اس سورت کی تفسیر لکھنے سے پہلے سرمایہ داری کے جواز کے بارے میں ایک مستقل کتاب "مسئلہ ملکیت زمین" لکھ چکے ہیں۔ جس میں وہ سرمایہ داری کو ڈنکے کی چوٹ جائز قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

> اسلام جس چیز کا آدمی کو پابند کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے پاس جو کچھ مال آئے، جائز راستے سے آئے۔ جائز طریقے پر استعمال ہو، جائز راستوں میں جائے اور خدا اور بندوں کے جو حقوق اس پر عائد کئے گئے ہیں وہ اس میں سے ادا کر دیئے جائیں۔ اس کے بعد جس طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو۔ اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو (ص ۱۰۹)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات کا صحیح صحیح ترجمہ کرنے کے بعد صاحب مفسر کو یاد آگیا کہ انہوں نے کہیں سرمایہ داری کو جائز قرار دیا ہے۔ اسلیئے وہ ترجمہ کی تشریح میں ہاتھ کی ایسی صفائی دکھاتے ہیں کہ انہی سرمایہ داری کی مذمت والی آیات سے اس کا جواز نکال لیتے ہیں ملاحظہ فرمایئے:۔

مال جمع کرنے کے لئے جَمَعَ مَالاً کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، جن سے مال کی کثرت کا مفہوم نکلتا ہے۔ پھر گن گن کر رکھنے کے الفاظ سے اس شخص کے بخل اور زر پرستی ننگا ہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ (صد ۴۵۹)

یعنی مال جمع کرنا فی نفسہ بُرا نہیں صرف زیادہ مال جمع کرنے سے منع فرمایا گیا۔ اور پھر سرمایہ دار کی مذمت اس کے سرمایہ کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے بخل اور زر پرستی کی وجہ سے ہے تاہم انہوں نے عربی زبان کا وہ قاعدہ نہیں بتایا جس کے مطابق وہ جمع مالاً (کہ جس کا سادہ ترجمہ "مال جمع کیا" ہے) سے مال کی کثرت کا مفہوم نکال رہے ہیں۔

قربانی فرض ہے

سورت الکوثر کی دوسری آیت فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ (پس تم اپنے رب ہی کیلئے نماز پڑھو اور قربانی کرو) کے بارے میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں بعض اس سے مراد سینے پر ہاتھ باندھنے کے لیتے ہیں اور بعض اس سے مراد قربانی کے۔ یہ تفصیلات بھی صاحب تفسیر کی زبانی سنیئے :-

"اس کی مختلف تفسیریں مختلف بزرگوں سے منقول ہیں۔ بعض حضرات نے نماز سے مراد پنجوقتہ فرض نماز لی ہے۔ بعض اس سے بقرعید کی نماز مراد لیتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ بجائے خود نماز مراد ہے اسی طرح وَانْحَرْ یعنی نحر کرو سے مراد بعض جلیل القدر بزرگوں سے یہ منقول ہے۔ کہ نماز میں بائیں ہاتھ پر دایاں ہاتھ رکھ کر اسے سینے پر باندھنا ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد نماز شروع کرتے وقت دونوں ہاتھ اٹھا کر تکبیر کہنا ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ افتتاحِ نماز کے وقت اور رکوع میں جاتے ہوئے اور رکوع سے اٹھ کر رفع یدین کرنا مراد ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد بقرعید کی نماز پڑھنا اور اس کے بعد قربانی کرنا ہے۔ لیکن جس موقع و محل پر یہ حکم دیا گیا ہے اس پر اگر غور کیا جائے تو اس کا مطلب صریحاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ اے نبی جب تمہارے رب نے تم کو اتنی کثیر اور عظیم بھلائیاں عطا کی ہیں تو تم اسی کے لئے نماز پڑھو اور اسی کیلئے قربانی کرو" (صد ۴۶۹)

مودودی صاحب کے ان الفاظ سے تو نعوذ باللہ یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ پہلے نبی صلعم کسی اور کے لئے نماز پڑھتے تھے یا قربانی دیتے تھے اور اب حضور سے فرمایا گیا کہ یہ اعمال صرف خدا کے لئے ادا کرو۔ دوسرے اس سے قربانی مراد لینے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ قربانی فرض ہے اور وہ بھی مکی دور سے کیونکہ یہ سورت مکی ہے۔ حالانکہ قربانی کے بارے میں جتنی بھی روایات ہیں اور جنہیں (سب کو) امام ابن حزم ضعیف قرار دیتے ہیں قربانی کی ابتدا مدنی دور میں ہوتی ہے۔ امام صاحب اپنی مشہور کتاب المحلی جلد ۷ صد ۳۵۵ پر قربانی کے بارے میں تمام احادیث کو نقل کرنے کے بعد ان کی صحت کے بارے میں فرماتے ہیں وَكُلُّ هٰذَا لَيْسَ بِشَيْءٍ یعنی ان تمام احادیث کی کوئی حیثیت نہیں۔ اور پھر اگلے صفحے پر اس کی فرضیت تو کجا جیسا کہ مودودی صاحب یہاں ثابت کرتے ہیں۔ وہ اس کے عدم وجوب پر صحابہ کرام کا اجماع نقل کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ لَا يَصِحُّ عَنْ اَحَدٍ مِّنَ الصَّحَابَةِ اَنَّ الْاُضْحِيَةَ وَاجِبَةٌ وَصَحَّ اَنَّ الْاُضْحِيَةَ لَيْسَتْ وَاجِبَةً (یعنی قربانی کے عدم وجوب پر صحابہ کرام کا اجماع ہے۔)

بعض اجل صحابہ جن میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ شامل ہیں اس خدشے سے سرے سے قربانی ہی نہیں کرتے تھے کہ کہیں اسے واجب نہ سمجھ لیا جائے۔ امام شافعی کتاب الام میں فرماتے ہیں۔ قَدْ بَلَغَنَا اَنَّ اَبَا بَکرٍ وعمر رضی اللہ عنہما کانا لا یضحیان کراھیۃ اَنْ یُقْتَدٰی بھما لیظنّ مَنْ راٰھما انھا واجبۃ (جلد دوم صہ ۱۸۹) یعنی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ رضی اللہ عنہما اس خدشے سے قربانی نہیں کرتے تھے کہ کہیں لوگ ان کی پیروی میں اسے واجب نہ سمجھ لیں۔ لیکن اس کے برعکس جماعت اسلامی اپنے لئے قربانی کی کھالیں کھری کرنے کے لئے مودودی صاحب اسے فرض قرار دیتے ہیں حالانکہ دلچسپ بات یہ ہے کہ جو صحابہؓ قربانی دیتے تھے وہ قربانی کی کھالوں کو اپنے ذاتی استعمال میں لاتے تھے (موطا امام مالک جلد ۱ صہ ۴۲۱) اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے فقہاء نے تو ان کھالوں کو فروخت کرنے کی اجازت دی ہے (بدایۃ المجتہد جلد اوّل صہ ۳۵۵) لیکن ان حضرات نے عامۃ الناس کو اس شرعی اجازت سے ہمیشہ اندھیرے میں رکھا ہے۔

کیا رسول اللہ صلعم اپنی ذات کیلئے انتقام لیتے تھے؟

حضور صلعم کردار کی جس بلندی پر تھے اسے دشمنانِ اسلام نے تسلیم کرتے ہوئے یہ اقرار کیا ہے کہ حضورؐ نے کبھی اپنی ذات کے لئے انتقام نہیں لیا۔ مدینہ کے مشہور جادوگر لبید بن لعصم جس نے روایات کے مطابق اپنے جادو سے حضور صلعم کو نقصان پہنچایا تھا، کا قصہ بیان کرتے ہوئے مودودی صاحب یہ اصول بیان فرماتے ہیں کہ چونکہ حضور صلعم اپنی ذات کیلئے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیتے تھے۔ اسلئے انہوں نے لبید کو معاف کر دیا۔ (صہ ۵۵۵) (اس جادو والے قصے کے بارے میں ہم بعد میں عرض کریں گے) لیکن اس کے ساتھ وہ ایسے تاریخی واقعات بھی سامنے لے آتے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضورؐ اپنی ذات کے لئے انتقام لیتے تھے۔ مثلاً سورت اللھب کی تفسیر کے دیباچے میں ابولہب کے ایک بیٹے کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ جس نے حضور صلعم پر تھوکا تھا، اگرچہ اس کا تھوک تو حضور صلعم پر نہیں پڑا تھا۔ لیکن آپ نے اسے بددعا دی جس سے وہ ہلاک ہو گیا (صہ ۵۲۲)

اب ان دونوں واقعات کو سامنے رکھئے۔ ایک واقعہ میں ایک غیر شخص آپ کی جان لینا چاہتا ہے اور روایات کے مطابق اپنے جادو کے زور سے آپ کو کسی حد تک نقصان پہنچانے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے اتنے بڑے جرم کے باوجود آپ اسے معاف کر دیتے ہیں۔ تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کے چچا کا بیٹا آپ پر تھوکتا ہے جو آپ پر نہیں پڑتا لیکن اس کے باوجود وہ اسے ایسی سخت بددعا دیتے ہیں کہ وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ شکر ہے کہ مودودی صاحب کے یہ تضادات اردو زبان میں ہیں اگر کسی بین الاقوامی زبان میں ہوتے تو ان کا سیرت رسول پر جو اثر پڑتا وہ ظاہر ہے۔

رسول اللہ پر جادو کے اثر کا واقعہ

قرآن مجید نے ان لوگوں کی مذمت کی ہے کہ جو حضور صلعم کو سحر زدہ قرار دیتے تھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا (سورہ بنی اسرائیل - ۴۷) (ظالم لوگ یعنی کفار کہتے ہیں کہ تم تو ایک سحر زدہ آدمی کی پیروی کرتے ہو) اسی بنا پر اکثر اہل علم نے ان روایات کو غلط قرار دیا ہے۔

جن میں حضور صلعم کو سحر زدہ ثابت کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس مودودی صاحب کا اصرار ہے کہ آپ پر نہ صرف یہ کہ جادو کیا گیا بلکہ آپ اس کے اثر سے دن بدن گھلتے چلے گئے۔ اس بارے میں انہوں نے معوذتین کے دیباچے میں تین چار صفحات پر جو تفصیلات نقل کی ہیں ان سب کا نقل کرنا تو ممکن نہیں۔ تاہم قارئین کو ان کے استدلال کی جھلک دکھانے کے لئے اس کا ٹکڑا نقل کئے بغیر چارہ نہیں فرماتے ہیں :۔

"صلح حدیبیہ کے بعد جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ واپس تشریف لائے تو محرم ۷ھ میں خیبر سے یہودیوں کا ایک وفد مدینہ آیا۔ اور ایک مشہور جادوگر لبید بن اعصم سے ملا۔ جو انصار کے قبیلہ بنی زریق سے تعلق رکھتا تھا۔ ان لوگوں نے اس سے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمارے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ تمہیں معلوم ہے ہم نے ان پر بہت جادو کرنے کی کوشش کی۔ مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ اب ہم تمہارے پاس آئے ہیں کیونکہ تم ہم سے بڑے جادوگر ہو۔ لو یہ تین اشرفیاں حاضر ہیں انہیں قبول کرو اور محمد پر ایک زور کا جادو کرو۔ اس زمانے میں حضور کے ہاں ایک یہودی لڑکا خدمت گار تھا۔ اس سے ساز باز کر کے ان لوگوں نے حضور کی کنگھی کا ایک ٹکڑا حاصل کر لیا جس میں آپ کے موئے مبارک تھے۔ انہی بالوں اور کنگھی کے دندانوں پر جادو کیا گیا۔ بعض روایات میں یہ ہے کہ لبید بن اعصم نے خود جادو کیا تھا اور بعض میں یہ ہے کہ اس کی بہنیں اس سے زیادہ جادوگرنیاں تھیں، ان سے اس نے جادو کرایا تھا۔ بہرحال ان دونوں صورتوں میں سے جو صورت بھی ہو، اس جادو کو ایک نر کھجور کے خوشے کے غلاف میں رکھ کر لبید نے بنی زریق کے کنویں ذروان یا ذی اروان نامی کی تہ میں ایک پتھر کے نیچے دبا دیا۔ اس جادو کا اثر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوتے ہوتے پورا ایک سال لگا، دوسری ششماہی میں کچھ تغیر مزاج محسوس ہونا شروع ہوا۔ آخری چالیس دن سخت اور آخری تین دن زیادہ سخت گزرے۔ مگر اس کا زیادہ سے زیادہ جو اثر حضور پر ہوا وہ بس یہ تھا کہ آپ گھلتے چلے جا رہے تھے۔ کسی کام کے متعلق خیال فرماتے کہ وہ کر لیا ہے مگر نہیں کیا ہوتا تھا۔ اپنی ازواج کے متعلق خیال فرماتے کہ آپ ان کے پاس گئے ہیں مگر نہیں گئے ہوتے تھے اور بعض اوقات آپ کو اپنی نظر پر بھی شبہ ہوتا تھا کہ کسی چیز کو دیکھا ہے مگر نہیں دیکھا ہوتا تھا" (صفحہ ۵۵۲)

اب اگر حضور صلعم پر جادو کے اس واقعہ کو تسلیم کر لیا جائے تو وہ کفار سچے بنتے ہیں جو آپ کو سحر زدہ کہتے تھے حالانکہ سورت بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ نے ایسا کہنے والوں کو جھٹلایا ہے۔ اب اگر سحر کے لغوی معنے سامنے رکھے جائیں تو اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز صورت سامنے آتی ہے۔ عربی زبان کی مشہور لغت تاج العروس میں اس کے یہ معنی دیئے گئے ہیں۔ وَاَصْلُ السِّحْرِ صَرْفُ الشَّيْءِ عَنْ حَقِيْقَتِهٖ اِلٰى غَيْرِهٖ یعنی سحر کا اصل یہ ہے کہ کسی چیز کی اصل حقیقت بدل دی جائے۔ اور یہ حقیقت کیسے بدل جاتی ہے۔ يُتَقَرَّبُ فِيْهِ اِلَى الشَّيْطَانِ وَبِمَعُوْنَةٍ مِنْهُ شیطان کی قربت حاصل کر کے اور اسکی مدد سے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک جادوگر نے شیطان کا قرب حاصل کر کے اور

سلہ ان روایات کے ضعیف ہونے کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن سلیم الفطرت انسانوں کے لئے یہی اشارہ ہی کافی ہے کہ کیا سات ہجری میں بھی حضور صلعم کو اپنے جاں نثاروں میں سے کوئی خدمتگار نہیں ملتا تھا کہ آپ نے ایک دشمن قوم کے فرد کو اس مقصد کیلئے اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔ —۱۲—

اسکی مدد سے آپ کی اصل حقیقت بدل دی۔ نعوذ باللہ من ذالک نقل کفر کفر نہ باشد۔ مجھے تو اس بات کا دکھ ہے کہ مودودی صاحب کے درباریوں میں سے کسی اہلِ علم کو ایسی لغویات کے پڑھنے سے کوئی خلش محسوس نہ ہوئی؟ جادو کے اس واقعہ کو اگر تسلیم کر لیا جائے تو پھر قریش مکہ کی عقل پر بھی ماتم کرنا پڑتا ہے کہ جب وہ تین اشرفی کی اُجرت دیکر حضور صلعم کو اتنا بڑا نقصان پہنچا سکتے تھے تو انہیں... خواہ مخواہ مختلف جنگوں میں اپنے لاتعداد بہادروں کی گردنیں کٹوانی پڑیں!

اسلام میں جھاڑ پھونک کی حقیقت

قرآن حکیم کی آخری دو سورتوں یعنی معوذتین کے دیباچے میں صاحب تفسیر ایک اور اہم مسئلے یعنی اسلام میں جھاڑ پھونک کی حقیقت پر بحث کرتے ہیں اور یہ ثابت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے نہ صرف یہ کہ اسکی اجازت دی بلکہ آپ خود بھی جھاڑ پھونک کرتے تھے اور بیماری کی حالت میں جھاڑ پھونک کرواتے تھے۔ (ص ۵۵) اب مشکل یہ ہے کہ ایسی متعدد روایات بھی موجود ہیں جن میں حضور صلعم نے نہ صرف جھاڑ پھونک سے منع فرمایا، بلکہ اسے اسلام میں سب سے بڑا گناہ یعنی شرک بھی قرار دیا۔ مودودی صاحب اس مشکل سے یہ کہہ کر چھٹکارا حاصل کر لیتے ہیں کہ بعض احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء میں حضورؐ نے جھاڑ پھونک سے بالکل منع فرما دیا تھا لیکن بعد میں اس شرط کے ساتھ اس کی اجازت دے دی کہ اس میں شرک نہ ہو (ص ۵۵)

مودودی صاحب نے اگرچہ جھاڑ پھونک کے جواز کے بارے میں متعدد روایات نقل کی ہیں لیکن نہی کے بارے میں اور خاص طور پر جس کا حوالہ ابھی ابھی دیا گیا ہے پورے الفاظ کے ساتھ نقل نہیں کیا بلکہ اس میں ابتداء کا لفظ اپنی جانب سے بڑھایا ہے۔ اسلئے مسئلہ کی وضاحت کے لئے ہم اس کے اصلی الفاظ نقل کرتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہٗ سے مروی ہے۔ قَالَ سَمِعْتُ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم یقول اِنَّ الرُّقی، والتمائم والتولۃ شرک (نیل الاوطار) فرماتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلعم کو یہ فرماتے سنا کہ دم کرنا اور گنڈے تعویذ وغیرہ شرک ہیں۔ یہی روایت مشہور حنفی مفسر جصاص نے اپنی تفسیر احکام القرآن کی جلد ۳ ص ۵۰ پر دی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ بعض روایات ایسی بھی ملتی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ آپؐ نے دو ایک عوارض کے علاج کے طور پر جھاڑ پھونک کی اجازت دی تھی، لیکن ہمیں ان کی صحت میں تامل ہے۔ ہمارے نزدیک قولِ فیصل اس باب میں حضورؐ کا وہی ارشاد ہے جس میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ میری اُمت میں سے جو لوگ بغیر کسی حساب کے جنت میں داخل کئے جائیں گے ان کی خصوصیات میں یہ بھی ہو گا کہ فَقَالَ هُمْ: لَا يَسْتَرْقُونَ وَلَا يَتَطَيَّرُونَ وَلَا يَكْتَوُونَ وَعَلَى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ حضور صلعم نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جو جھاڑ پھونک نہیں کراتے اور بدشگونی نہیں لیتے اور نہ داغ دیتے ہیں اور اپنے رب پر توکّل کرتے ہیں۔

یعنی حضور صلعم تو جھاڑ پھونک کو ختم کرتے کراتے اس حد تک لے آئے کہ ہر نیک مومن اس سے دور رہے۔ لیکن ہمارے فاضل مفسر نہ صرف اس کی اجازت دیتے بلکہ اسے حضور صلعم کا اپنا عمل ثابت کرتے ہیں۔

باقی صہ۳۲ پر

خدا کے لئے رُک جایئے

(مودودی صاحب سے ایک دردمندانہ اپیل)

واقعات اس امر کی شہادت دیتے چلے آرہے ہیں کہ پاکستان آنے کے لئے مودودی صاحب کے پیشِ نظر دو بنیادی مقصد تھے۔ ایک تو یہ کہ اس مملکت کو پنپنے نہ دیا جائے اور دوسرے یہ کہ اسلام کو اس شکل میں پیش کیا جائے جس سے تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ اس سے متنفر ہو جائے۔ اس سیلاب زر کے بل بوتے پر جو نہ معلوم کہاں سے مسلسل چلا آرہا ہے وہ ان مقاصد میں کس حد تک کامیاب ہو گئے ہیں، ظاہر ہے۔ طلوعِ اسلام شروع ہی سے قوم کو ان کے ان مذموم عزائم سے آگاہ کرتا اور تا بحدِ امکان ان کا تعاقب کرتا چلا آرہا ہے۔ اسلام کے خلاف ان کا بھرپور وار ان کی نام نہاد تفسیر "تفہیم القرآن" کی شکل میں سامنے آیا۔ اس کے ایک گوشے سے متعلق تنقید طلوعِ اسلام کے صفحات پر مسلسل شائع ہو رہی ہے لیکن اسلام کو بہ حیثیتِ مجموعی انہوں نے کس قدر راضحوکہ بنا دیا ہے اس کے متعلق ہم مبسوط طور پر لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہم سمجھتے تھے کہ تفہیم القرآن کی تکمیل کے بعد ان کی ہوسِ انتقام کی تسکین ہو گئی ہوگی۔ — ویسے بھی وہ اب عمر کی اس منزل میں داخل ہو رہے ہیں جہاں انسان بالعموم اپنی عمرِ رفتہ پر نگہِ بازگشت ڈالنے اور (اگر سعادت یاوری کرے تو) اپنی غلط کوشیوں کی تلافی (یا کم از کم ان پر ندامت) کے لئے رُک جاتا ہے۔ لیکن انہوں نے حال ہی میں اپنے جس آئندہ پروگرام کا اعلان کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی ان کا جی نہیں بھرا، وہ اپنے ترکش کو باقی ماندہ تیروں سے بھی خالی کرنے کی فکر میں ہیں۔ اب ان کا ہدف کون ہوگا اس کے تصور سے بھی ہماری روح کانپ اٹھتی ہے، اور ہماری روح کی یہی وہ تھرتھری اور کپکپی ہے جس کی بنا پر ہم آج ان سے یہ اپیل کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ اسلام کے ساتھ مسلمان کے تعلق اور وابستگی کی اساس و بنیاد حضور خاتم النبیینؐ کی ذاتِ اقدس و اطہر کی عظمت و احترام کا احساس ہے اگر اس عظمت و احترام میں ذرا سا بھی فرق آجائے تو پھر انسان کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق باقی نہیں رہ سکتا۔ اور اب مودودی صاحب کا پروگرام یہ ہے کہ نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے دلوں میں یہ جذبہ بھی باقی نہ رہنے پائے — فرمایئے! یہ حقیقت ایسی ہے یا نہیں جس کے تصور سے انسان کی روح پر کپکپی طاری ہو جائے! اللہ ہم سب پر رحم کرے۔

مودودی صاحب نے کچھ عرصہ پہلے ایک کتاب شائع کی تھی ---- خلافت و ملوکیت — جو اپنی رسوائی کی بناء پر کافی شہرت حاصل کر گئی تھی۔ ایسا نظر آتا ہے کہ وہ کتاب مودودی صاحب کے اس پروگرام کی پہلی کڑی تھی۔ یا یوں کہیئے کہ اسے انہوں نے (FEELER) کے طور پر قوم کے قلوب و اذہان کے میدان میں پھینکا تھا۔ ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ بالعموم پوچھا کرتا ہے کہ اسلام کے اصول و نظریات عدیم النظیر سہی لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ نظریات کبھی عمل میں بھی آ

آسکے اور یہ کہ تعلیم نبوی نے وہ کونسے نتائج پیدا کئے جن کی بنا پر حضورؐ کو عالمِ انسانیت میں اس قدر بلند و بالا مقام حاصل ہے۔ اس کے جواب میں انہیں بتایا جاتا ہے کہ یہ نظریات اسلام کے صدرِ اول میں ایک عملی نظام کی شکل میں دنیا کے سامنے آگئے اور وہ نظام قائم ہوا۔ ان برگزیدہ افراد (صحابہ کرامؓ) کے ہاتھوں جو تعلیم و تربیت نبویؐ کے ثمرات تھے اور یہ حضورؐ کا وہ عظیم کارنامہ ہے جس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ مودودی صاحب نے اپنی محولہ بالا کتاب میں اس دور کی ایسی گھناؤنی تصویر کھینچی اور ممتاز صحابہ کبارؓ کی سیرت و کردار کو ایسے رنگ میں پیش کیا جس سے ہمارا یہ نوجوان طبقہ نفسِ اسلام ہی سے برگشتہ ہو گیا۔ اس کتاب پر مفصل تنقید طلوعِ اسلام کے صفحات پر آچکی اس لئے ہم اس مقام پر اس کے متعلق تفصیل سے کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ تجدیدِ یاد داشت کے لئے دو ایک اقتباسات کافی ہوں گے۔ (مثلاً) انہوں نے حضرت عثمانؓ کو ہدفِ تنقید بناتے ہوئے لکھا کہ ان کی اقربا نوازی اور خاندان پروری کی روش نے مملکت کو سخت نقصان پہنچایا۔ "انہوں نے پے در پے اپنے رشتہ داروں کو بڑے بڑے عہدے عطا کئے اور ان کے ساتھ دوسری ایسی رعایات کیں جو عام طور پر لوگوں میں ہدفِ اعتراض بن کر رہیں"۔ (خلافت ملوکیت۔ صـ۱۰۶)

حضرت معاویہؓ کے متعلق لکھا۔

"انہوں نے لڑ کر خلافت حاصل کی۔ مسلمانوں کے راضی ہونے پر ان کی خلافت کا انحصار نہ تھا۔ انہوں نے ان کو خلیفہ نہیں بنایا۔ وہ خود اپنے زور سے خلیفہ بنے"۔ (صـ۱۵۸)

یہ تنقید حضرت معاویہؓ ہی پر نہیں، تمام صحابہؓ رسول اللہ پر تھی، جنہوں نے حضرت معاویہؓ کو خلیفہ برحق تسلیم کر لیا تھا۔ حضرت عثمانؓ کی اقربا نوازی کے سلسلہ میں لکھا کہ انہوں نے اپنے بھائی ۔۔۔ ولید بن عقبہؓ کو:

"حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی جگہ کوفے جیسے بڑے اور اہم صوبے کا گورنر بنا دیا۔ وہاں یہ راز فاش ہوا کہ یہ شراب کے عادی ہیں۔ حتیٰ کہ ایک روز انہوں نے صبح کی نماز چار رکعت پڑھا دی اور پھر پلٹ کر لوگوں سے پوچھا اور پڑھاؤں؟" (صـ۱۱۱)

یہ ولید بن عقبہؓ کون تھے؟ رسول اللہ کے ایک صحابیؓ جو حضرت صدیق اکبرؓ اور عمر فاروقؓ کے زمانے میں قابلِ اعتماد مناصب پر سرفراز رہے۔ ان کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ وہ شراب کے اس حد تک عادی تھے کہ، گورنری کے عہدہ پر فائز ہونے کے باوجود نماز کی امامت بھی نشہ کی حالت میں کیا کرتے تھے! استغفراللہ۔

سیرتِ صحابہؓ پر مودودی صاحب کے یہ ۔۔ رکیک حملے، بلا واسطہ تو ان حضرات پر تھے لیکن بالواسطہ ان کی زد خود حضور رسالتمآبؐ کی ذاتِ گرامی پر پڑتی تھی، اس لئے کہ دنیا میں مشہور ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ سو جس درخت (سدرۃ المنتہٰی) کے پھل (معاذ اللہ) اس قسم کے ہوں اس درخت کے متعلق جس قسم کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، ظاہر ہے۔ یہی وجہ ہے جو ہم نے کہا ہے کہ مودودی صاحب کی وہ جرأت (خلافت و ملوکیت جیسی مذموم کتاب کی اشاعت) درحقیقت قدمِ اوّل تھا اس منزل تک پہنچنے کے لئے جس کا اعلان انہوں نے اب کیا ہے۔ انہوں نے (تفہیم القرآن سے فارغ ۔۔۔ ہو جانے کے بعد) کہا کہ انہوں نے اپنے کچھ رفقاء کو اس کام پر لگا دیا ہے کہ وہ ۔۔ مختلف مجلات اور کتب سے ان کی ان تحریروں کو چن چن کر الگ کریں جو سیرتِ نبویؐ سے متعلق ہیں۔ ان پر مزید حواشی کے بعد اسے کتابِ سیرت کی شکل میں شائع کیا جائے گا۔ ہم اس سے پہلے دیکھ چکے ہیں کہ مودودی صاحب حضور رسالتمآبؐ کی سیرت

حلیہ کے متعلق کس قسم کا نقشہ پیش کیا کرتے ہیں۔ (مثلاً) ۱۹۵۸ء میں ان کی جماعت کے بعض نہایت سربرآوردہ حضرات ان سے الگ ہو گئے اور اپنے فیصلہ کی تائید میں کہا کہ امیر جماعت (مودودی صاحب) غلط بیانیوں سے بھی کام لیتے ہیں اور اصول شکنی سے بھی تو مودودی صاحب نے ان کے جواب میں فرمایا کہ اگر میں نے یہ کچھ کیا ہے تو کونسا جرم کیا ہے خود رسول اللہ بھی (توبہ۔ توبہ پناہ بخدا) یہی کچھ کیا کرتے تھے۔ جہاں تک جھوٹ بولنے کا تعلق ہے۔

راستبازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں بدترین برائی ہے۔ لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اسکے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔

اس "اصول" کے بعد کہا:

"اس کی عملی مثالیں بھی احادیث میں موجود ہیں۔ کعب بن اشرف کے قتل کے لئے محمد بن مسلمہؓ کو جب حضورؐ نے مامور کیا تو انہوں نے اجازت مانگی کہ اگر کچھ جھوٹ بولنا پڑے تو بول سکتا ہوں؟ حضورؐ نے بالفاظ صریح انہیں اجازت دیدی"۔ (ترجمان القرآن بابت مئی ۱۹۵۸ء۔ صفحہ ۵۵-۵۴)

مودودی صاحب کے خلاف دوسرا اعتراض یہ تھا کہ جماعت کی تاسیس کے زمانے میں وہ بڑے بلند آہنگ اصول پیش فرمایا کرتے تھے لیکن پاکستان میں جب وہ اقتدار کے پیچھے پڑے تو ان تمام اصولوں کو پس پشت ڈال دیا۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے کہا کہ (معاذ اللہ) خود رسول اللہ نے بھی ایسا ہی کیا تھا:

"اسلامی نظام کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبائلی امتیازات کو ختم کر کے اس برادری میں شامل ہونے والے سب لوگوں کو یکساں حقوق دیئے جائیں اور تقویٰ کے سوا فرق مراتب کی کوئی بنیاد نہ رہنے دی جائے۔ اس چیز کو قرآن مجید میں بھی پیش کیا گیا اور حضورؐ نے بھی باربار اس کو نہ صرف زبان مبارک سے بیان فرمایا بلکہ عملاً موالی اور غلام زادوں کو امارت کے مناصب دیکر واقعی مساوات قائم کرنے کی کوشش بھی فرمائی۔ لیکن جب پوری مملکت کی فرمانروائی کا مسئلہ سامنے آیا تو آپ نے ہدایت دی کہ الائمۃ من قریش "امام قریش میں سے ہوں" ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس خاص معاملہ میں یہ ہدایت مساوات کے اس عام اصول کیخلاف پڑتی ہے جو کلیہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ (رسائل و مسائل۔ حصہ چہارم صفحہ ۳۳۰-۳۲۹)

آپ ان دو اقتباسات کو دیکھئے اور پھر سوچئے کہ ان سے ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں حضور رسالتمآب کی سیرت و کردار کے متعلق کس قسم کا تصور ابھرتا ہے؟

اور جی کڑا کر کے ان کی تالیف۔ رسائل و مسائل۔ حصہ دوم سے بھی ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ لکھتے ہیں:

"حضرت ماریہ قبطیہؓ کے بارے میں مدینہ کے منافقین نے یہ افواہ اڑا دی تھی کہ اپنے چچا زاد بھائی سے ان کا ناجائز تعلق ہے۔ رفتہ رفتہ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کانوں تک بھی پہنچی۔ آپ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ "اذھب۔ فان وجدتہ عند ماریۃ فاضرب عنقہ"

جاؤ: اگر تم اس کو ماریہ کے پاس پاؤ تو اس کی گردن مار دو"۔ بعید نہیں کہ کہنے والے نے حضورؐ سے یہ کہا ہو کہ وہ وہاں اس وقت موجود ہے۔ آپ کسی کو بھیج کر دیکھ لیں اور اس پر حضورؐ نے فرمایا ہو کہ۔ اگر وہ وہاں کسی

نامناسب حالت میں پایا جائے تو جان سے مار دو۔ اس حکم کے مطابق حضرت علیؓ جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ وہ ایک حوض میں نہا رہا ہے۔ آپ نے جاتے ہی اُسے ڈانٹا اور ہاتھ پکڑ کر اُسے حوض سے کھینچ لیا۔ ظاہر ہے کہ جو شخص پانی سے بھرے ہوئے حوض میں اترا ہو اس کے بارے میں باہر سے دیکھنے والے کو بیک نظر یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ وہ ننگا ہے یا ستر ڈھانکے ہوئے ہے۔ جب حضرت علیؓ نے اس کو باہر کھینچا تو دیکھا کہ آپ کی نظر اس کے ستر پر پڑی اور معلوم ہوا کہ وہ مقطوع الذکر ہے (یعنی مخنث۔ طلوعِ اسلام) آپ نے اسی وقت اُسے چھوڑ دیا۔ اور آکر حضورؐ کو حقیقت بتادی۔

اب فرمائیے کہ اس واقعہ پر کیا اعتراض ہے اور کس پہلو سے ہے؟ (صفحہ ۵۵-۵۴)

اس وقت مودودی صاحب کے اس قسم کے "شہ پارے" ان کے مختلف رسائل و تالیفات میں بکھرے پڑے ہیں اور بالعموم لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔ لیکن آپ سوچئے کہ جب انہیں یکجا کر کے مرتب شکل میں شائع کیا جائے گا۔ اور اس مجموعہ کو قرار دیا جائے گا "سیرت النبی" تو حضور رسالتمآب کی سیرت و کردار کے متعلق کس قسم کا تصور سامنے آئے گا! یہ تھا وہ احساس جس سے دل تڑپ تڑپ اٹھا اور ہم نے (زندگی میں پہلی مرتبہ) مودودی صاحب کی خدمت میں یہ درخواست پیش کرنے کی ضرورت سمجھی۔ حضور رسالتمآبؐ کی عظمت و احترام کا مقام تو وہ ہے کہ درخواست تو ایک طرف اگر ہمیں یقین دلا دیا جائے کہ ایسا کرنے سے وہ مان جائیں گے تو ہم مودودی صاحب کے پاؤں بھی پڑ جائیں اور دل کے ٹکڑے آنسوؤں کی شکل میں ان کی خدمت میں پیش کر کے یہ التجا کریں کہ ـــ خدا کے لئے رُک جائیے۔ اس ذاتِ گرامی تک ہاتھ نہ بڑھائیے کہ جن سے بلند و بالا اس کائنات میں کوئی ہستی نہیں۔ اور جن کا مقام یہ ہے کہ

چمن دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو — جو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
بزم توحید بھی دنیا میں نہ ہو، تم بھی نہ ہو — یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو، خم بھی نہ ہو

خیمہ افلاک کا استادہ اس نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اس نام سے ہے

اور جن پر خدا اور اس کے ملائکہ تحسین و تبریک کے پھول برساتے ہیں۔

ان اللّٰہ و ملئکتہ یصلون علی النبی۔ یآیھا الذین آمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما۔ (۵۶/۳۳)

یہ جو ہم نے لکھا ہے کہ مودودی صاحب کی مجوزہ "تالیف" اسی قسم کے مزخرفات کا مجموعہ ہوگی تو یہ ہماری محض قیاس آرائی نہیں۔ انہوں نے اپنے ماہنامہ "ترجمان القرآن" (بابت جون ۱۹۶۳ء) میں اس کتاب کا ایک باب شائع بھی کر دیا ہے جس کا عنوان ہے "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان" اور اس کی ابتدا کی ہے حضرت ابراہیمؑ کے تذکرہ جمیلہ سے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے لکھا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے کس طرح اپنی بیوی اور اس کے شیرخوار بچے کو ایک صحرا میں جہاں آبادی تو ایک طرف کسی انسان کا نام و نشان تک دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ایک مشکیزہ پانی دیکر چھوڑ دیا۔ لکھتے ہیں کہ

حضرت ابراہیمؑ حضرت ہاجرہ اور ان کے بیٹے اسماعیلؑ کو، جبکہ وہ ابھی دودھ پی رہے تھے، لے کر آئے اور ان کو ایک درخت کے نیچے اس جگہ چھوڑ دیا جہاں بعد میں زمزم نکلا۔ مکہ کی سنسان وادی میں اس وقت کوئی ایک انسان بھی موجود نہ تھا۔ اور نہ کہیں پانی پایا جاتا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے چمڑے کا ایک تھیلا جس میں کھجوریں تھیں، اور پانی کا ایک مشکیزہ حضرت ہاجرہ کو دیا اور واپس روانہ ہو گئے۔ وہ ان کے پیچھے چلیں اور کہنے لگیں اے ابراہیمؑ کہاں جا رہے ہو؟ اور ہمیں اس سنسان بے آب و گیاہ وادی میں چھوڑے جاتے ہو؟ یہ بات حضرت ہاجرہ نے کئی مرتبہ کہی مگر حضرت ابراہیمؑ نے پلٹ کر نہ دیکھا[1]۔ آخر حضرت ہاجرہ نے کہا کیا اللہ نے آپ کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہے؟ جواب میں انہوں نے بس اتنا فرمایا کہ ہاں۔ اس پر وہ بولیں کہ اگر یہ بات ہے تو اللہ ہمیں ضائع نہیں فرمائے گا۔ اور پلٹ کر بیٹے کے پاس آ بیٹھیں۔ حضرت ابراہیمؑ جب پہاڑ کی اوٹ میں پہنچے جہاں سے یہاں بیٹھے نظر نہ آتے تھے تو بیت اللہ کی طرف، (یعنی اس جگہ کی طرف جہاں آخرکار انہیں بیت اللہ تعمیر کرنا تھا) رخ کیا اور اللہ تعالیٰ سے عرض کیا۔ رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُم مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ۔ "پروردگار، میں نے ایک بے آب و گیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے۔ پروردگار، یہ میں نے اس لئے کیا ہے کہ یہ یہاں نماز قائم کریں، لہٰذا تو لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا اور انہیں کھانے کو پھل دے شاید کہ یہ شکر گزار بنیں۔"

(ابراہیم - ۳۷) ادھر اسماعیل علیہ السلام کی والدہ ان کو دودھ پلاتی رہیں اور مشکیزہ کا پانی پیتی رہیں۔ جب پانی ختم ہو گیا تو انہیں اور بچے کو پیاس لگنی شروع ہوئی۔ وہ بچے کو تڑپتا ہوا دیکھتی رہیں۔ آخر بچے کی حالت ان سے نہ دیکھی گئی اور وادی کی طرف یہ دیکھنے کے لئے چل پڑیں کہ کوئی آدمی نظر آئے، مگر کوئی نظر نہ آیا۔ پھر صفا کی پہاڑی سے اتر کر وادی کے بیچ میں آئیں اور اپنا بازو اٹھا کر اس طرح دوڑیں جیسے کوئی مصیبت زدہ انسان دوڑتا ہے۔ پھر مروہ کی پہاڑی پر چڑھ کر دیکھنے لگیں کہ کوئی آدمی نظر آتا ہے یا نہیں۔ مگر کوئی نظر نہ آیا۔ یہ فعل انہوں نے سات مرتبہ (صفا اور مروہ کے درمیان) کیا۔ ابن عباس کہتے

---

[1] پلٹ کر نہ دیکھنے کی وجہ بے دردی اور بے پروائی نہ تھی۔ حضرت ابراہیمؑ پیغمبر عظیم ہی سہی، بہرحال تھے تو انسان ہی — اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں اتنا بڑا خطرہ مول لے رہے تھے کہ پہاڑوں کے درمیان ایک سنسان وادی میں اپنے دودھ پیتے بچے اور اس کی ماں کو چھوڑے جا رہے تھے۔ اس وقت ان کے دل پر جو کچھ گزر رہی ہو گی اس کا اندازہ اس صورت حال کا تصور کر کے ہر شخص کر سکتا ہے۔ اس حالت میں اگر وہ بیوی اور بچے کی طرف پلٹ کر دیکھتے تو ممکن ہے کہ دل بھر آتا اور ارادے میں تزلزل پیدا ہو جاتا۔ اس لئے سینے پر پتھر رکھ کر چل پڑے اور جب پیچھے آنے والی بیوی نے بار بار پوچھا تو اس کی طرف دیکھے بغیر بس ہاں کہہ دیا۔ (مفہم)

ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسی وجہ سے لوگ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتے ہیں[1]۔ آخری مرتبہ جب وہ مروہ کی پہاڑی پر چڑھیں تو انہوں نے ایک آواز سنی۔ اپنے آپ سے کہنے لگیں "چپ رہ" (یعنی شور مچانا بند کر) اور غور سے سننے لگیں۔ آواز پھر آئی۔ انہوں نے کہا "اے شخص، تو نے اپنی آواز مجھے سنا دی، کیا تیرے پاس میری فریاد رسی کے لئے کچھ ہے؟ یکایک انہوں نے زمزم کے مقام پر ایک فرشتہ دیکھا (ابراہیم بن نافع اور ابن جریج کی روایت میں ہے کہ جبریل کو دیکھا) کہ وہ اپنی ایڑی یا بازو سے زمین کھود رہے ہیں، یہاں تک کہ پانی نکل آیا۔ حضرت ہاجرہ لپ بھر بھر کر وہ پانی مشکیزہ میں بھرنے لگیں اور جیسے جیسے وہ پانی بھرتی گئیں پانی ابل ابل کر اوپر آتا رہا۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ اسماعیل کی ماں پر رحمت فرمائے، اگر وہ زمزم کو اسی حالت پر چھوڑ دیتیں (یعنی چاروں طرف مٹی ڈال کر اسے نہ گھیر لیتیں) تو زمزم بہتا ہوا چشمہ ہوتا"۔ اس طرح حضرت ہاجرہ پانی پینے لگیں۔ اور اپنے بچے کو دودھ پلانے لگیں۔ فرشتے نے ان سے کہا "ضائع ہونے کا اندیشہ نہ کرو۔ یہاں اللہ کا گھر ہے جسے یہ بچہ اور اس کا باپ دونوں تعمیر کریں گے اور اللہ اس گھر کے لوگوں کو ضائع نہیں کرے گا۔" (ترجمان القرآن بابت جون ۳۰ء صفحہ ۱۷-۱۹)

آپ سوچئے کہ جب یہ "واقعہ" ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ کے سامنے آئیگا تو خدا اور اس کے رسولوں کے متعلق ان کے دل میں کس قسم کے خیالات ابھریں گے؟

یہ داستان درحقیقت تورات کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ حضرت ابراہیمؑ کی مصری بیوی حضرت ہاجرہؑ کے بطن سے تھے۔ جب وہ ۱۴ سال کے ہوئے تو آپ کی دوسری بیوی حضرت سارہؓ کے بطن سے حضرت اسحاقؑ پیدا ہوئے۔ انہوں نے برہنائے حسد حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ وہ حضرت اسماعیلؑ اور ان کی والدہ کو بن باس دیدیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے بحکم خداوندی ایسا کر دیا۔ تورات کی اس داستان پر تبصرہ کرتے ہوئے مودودی صاحب لکھتے ہیں

"حضرت سارہ اور حضرت ابراہیمؑ کی جو گھناؤنی سیرت اس داستان میں پیش کی گئی ہے (جس میں ساتھ ساتھ خود اللہ تعالیٰ کو ملوث کر دیا گیا ہے) اس سے خود بنی اسرائیل کے اخلاقی تصورات کی پستی ظاہر ہوتی ہے۔ اس میں ایک پیغمبر (حضرت ابراہیمؑ) کی بیوی اور دوسرے پیغمبر (حضرت اسحاقؑ) کی والدہ اس صورت میں ہمارے سامنے آتی ہیں کہ وہ سوکن کے نوجوان بیٹے کا ہنسنا تک برداشت نہیں کرتیں اور شوہر کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ اسے اور اس کے لڑکے کو اپنی وراثت سے محروم کر کے گھر سے نکال دے۔ شوہر جو ایک جلیل القدر پیغمبر ہیں، اس شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں کہ وہ اپنے ۱۵ یا ۱۶ برس کے بیٹے کو اس کی ماں سمیت صرف روٹی اور پانی کا ایک مشکیزہ دے کر بیابان میں

---

[1] یہ اس واقعہ کا اہم ترین تاریخی ثبوت ہے۔ کعبہ کی تعمیر کے بعد جب سے حج کا سلسلہ حضرت ابراہیمؑ ہی کے زمانے میں شروع ہوا اس وقت سے آج تک سینکڑوں پھر ہزاروں، پھر لاکھوں، پھر کروڑوں انسان اس واقعہ کی یاد میں سعی بین الصفا والمروۃ کرتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ ہزاروں برس کا متواتر عمل جو بلا انقطاع اُس وقت سے آج تک ہو رہا ہے، اس واقعہ کا ایسا ثبوت ہے جس سے بڑھ کر کسی تاریخی واقعہ کا ثبوت دنیا میں موجود نہیں ہے اس کے برعکس بائبل بیابانِ فاران کا جو واقعہ بیان کرتی ہے وہاں نہ پہلے کبھی اس طرح کی سعی ہوئی نہ آج ہو رہی ہے۔ (مصنف)

چھوڑ دیتے ہیں اور پھر اس کی پروا نہیں کرتے کہ یہ مرتے ہیں یا جیتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی یہ شان ہمیں دکھائی جاتی ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے جدِ امجد حضرت اسحاقؑ اور ان کی ماں کی خاطر حضرت ابراہیمؑ کو یہ ہدایت فرماتا ہے کہ اسحاقؑ کی ماں سوکناپے کے جلاپے کی بنا پر اُن سے جس ظلم کی فرمائش کر رہی ہیں اس کا وہ ارتکاب کر ڈالیں۔ یہ ساری داستان خود اپنی داخلی شہادت کی بنا پر جھوٹ کی ایک پوٹ ہے۔ تاریخ کے باعزت نام سے اس کو موسوم کرنا لفظِ تاریخ کی توہین ہے۔" (ترجمان القرآن بابت جون ۱۹۵۳ء صفحہ ۱۵)

تورات کی اس داستان پر تبصرہ کرنے کے بعد مودودی صاحب لکھتے ہیں :۔

"اس کے مقابلہ میں صحیح تاریخ ہم کو قرآن و حدیث سے معلوم ہوتی ہے جس کی تائید ۴ ہزار برس کی متواتر روایات کرتی ہیں جو اہلِ عرب میں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی رہی ہیں۔" (صفحہ ۱۵) تورات میں تھا کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی بیوی کو ۱۵-۱۶ سال کے جوان بیٹے کے ساتھ، جنگل میں چھوڑا۔ اسے مودودی صاحب ایسا ظلم قرار دیتے ہیں جو نہ (حکم دینے والے) خدا کے شایانِ شان تھا اور نہ ہی (اس حکم کی تعمیل کرنے والے) خدا کے ایک پیغمبر کے مناسب حال۔ وہ اسے "جھوٹ کی ایک پوٹ" ٹھہراتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں وہ اس روایت کو صحیح تاریخ اور خدا اور اس کے پیغمبر کے عین شایانِ شان قرار دیتے ہیں جس میں حضرت ابراہیمؑ ایک شیر خوار بچے کو اس کی ماں کیساتھ ایک تھیلہ کھجور اور ایک مشکیزہ پانی دے کر لق و دق صحرا میں چھوڑ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "یہ صحیح تاریخ ہم کو قرآن و حدیث سے معلوم ہوتی ہے" حالانکہ قرآن کریم میں کہیں، یہ نہیں آیا کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے شیر خوار بچے اور اس کی والدہ کو اس طرح صحرا میں چھوڑ دیا تھا۔ قرآن کریم کو اس قسم کے واقعہ کے ساتھ ملوث کرنا کھلی ہوئی تکذیب اور تحریف ہے اور انتہا درجہ کی دیدہ دلیری؟

جب مودودی صاحب پر اعتراض کیا جائے کہ وہ اس قسم کی وضعی داستانیں اور فرضی قصے کہانیاں جن سے حضرات انبیاء کرام، بالخصوص حضور خاتم النبیینؐ کی سیرت اس طرح داغدار ہو کر سامنے آتی ہے، کیوں لکھتے ہیں تو ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ میں انہیں اپنی طرف سے تھوڑا لکھتا ہوں، یہ کتب تاریخ اور احادیث میں مذکور ہیں اور میں انہی کے حوالوں سے انہیں درج کرتا ہوں۔ چنانچہ ہم نے مودودی صاحب کے جو اقتباسات اوپر دیئے ہیں ان کی تائید میں انہوں نے کتب تاریخ اور روایات کے حوالے درج کئے ہیں۔ یہ مقام غور سے سمجھنے کے قابل ہے۔

کتب تاریخ کے متعلق مسلمانوں کے کسی فرقہ کا بھی یہ عقیدہ نہیں کہ ان میں صرف صحیح واقعات درج ہیں۔ ہر ایک کو اس کا اعتراف ہے کہ ان میں صحیح اور غلط رطب و یابس ہر قسم کے واقعات درج ہیں۔

جہاں تک کتب احادیث کا تعلق ہے اہلِ حدیث حضرات کا یہ عقیدہ ہے کہ ان میں سے بخاری اور مسلم کی ہر حدیث صحیح ہے اور ان کی کسی ایک روایت کا انکار بھی مسلمان کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ وہ اگر اپنے ہاں اس قسم کے واقعات کو بیان یا درج کریں تو (بنا بر عقیدہ) ان کی پوزیشن (یا مجبوری) قابلِ فہم ہوتی ہے۔ لیکن مودودی صاحب کا عقیدہ یہ نہیں۔ تاریخ اور دیگر کتب احادیث تو ایک طرف ان کا عقیدہ یہ ہے کہ

"یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں ان کے مضامین کو بھی جوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہیئے" (ترجمان القرآن بابت اکتوبر، نومبر ۱۹۵۲ء)

وہ دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔

"اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہ کی طرف منسوب ہو اس کی نسبت کا صحیح و معتبر ہونا بجائے خود زیر بحث ہوتا ہے۔ آپ (فریق مقابل) کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیث رسول اللہ مان لینا ضروری ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں۔ ہم سند کی صحت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے (رسائل و مسائل حصہ اول صفحہ ۲۹)

اس سے ظاہر ہے کہ احادیث کے معاملہ میں مودودی صاحب کی مجبوری اہل حدیث حضرات کی سی نہیں کہ انہیں ہر اس حدیث کو جسے سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیدیا گیا ہو۔ صحیح ماننا ضروری ہوتا ہے۔ مودودی صاحب احادیث کے مجموعوں میں سے صحیح اور غلط کا انتخاب اپنے معیار کے مطابق خود کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو واقعات انہوں نے (مندرجہ بالا مثالیں ہیں) درج کئے ہیں انہیں وہ خود صحیح مانتے ہیں۔ ان کی مجوزہ تالیف سیرت، اسی قسم کے "صحیح" واقعات کا مجموعہ ہوگی۔

لیکن مودودی صاحب، روایات کو اس طرح پرکھنے کے جملہ حقوق اپنی ذات کیلئے محفوظ قرار دیتے ہیں اگر کوئی شخص کسی ایسی حدیث کو جسے وہ صحیح قرار دیدیں ضعیف یا وضعی کہہ دے تو وہ اسے منکر حدیث قرار دیکر اپنے عندہ کو اس کے پیچھے لگا دیتے ہیں۔ انہوں نے طلوع اسلام کو جو منکر حدیث مشہور کر رکھا ہے تو اسکی وجہ یہی ہے کہ طلوع اسلام ان کی اس قسم کی پیش کردہ روایات کے متعلق کہتا ہے کہ بابا! خدا کا خوف کرو۔ اس طرح خدا اور اس کے رسولوں کو کیوں بدنام کرتے ہو! مثلاً "مقطوع الذکر" والی روایات آپ دیکھ چکے ہیں اس روایت کو درج کرنے کے بعد انہوں نے لکھا کہ

یہ بات بھی عرض کر دوں کہ سند کے لحاظ سے یہ روایت ضعیف نہیں ہے (رسائل و مسائل حصہ دوم صفحہ ۵۵)

اس پر طلوع اسلام نے عرض کیا کہ روایات کے سلسلہ میں آپ کا معیار تو یہ ہے کہ آپ سند کی صحت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے تو اس حدیث کو سند کی رو سے کیسے صحیح سمجھ رہے ہیں۔ جب ایک صاحب نے ان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی تو آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے کیا ارشاد فرمایا۔ انہوں نے لکھا کہ ہمیں ان لوگوں کے جواب میں خاموشی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے کہ

> یہ لوگ اپنی بحث میں بالعموم بازاری غنڈوں کا سا طرز اختیار کرتے ہیں۔ ان کے مضامین پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی شخص ایک غلاظت بھری جھاڑو ہاتھ میں لئے کھڑا ہو اور زبان کھولنے کے ساتھ ہی مخاطب کے منہ پر اس جھاڑو کا ایک ہاتھ رسید کر دے۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کے منہ لگنا کسی شریف آدمی کے بس کی بات نہیں ہے اور نہ اس قماش کے لوگ اس لائق سمجھے جا سکتے ہیں کہ ان سے کوئی علمی بحث کی جائے۔
>
> (رسائل و مسائل۔ حصہ دوم صفحہ ۵۶)

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں (اور جس کا خود مودودی صاحب کو بھی اعتراف ہے) ہماری کتب تاریخ اور احادیث میں غلط اور صحیح ہر قسم کی روایات پائی جاتی ہیں۔ ہمارا مسلک اس باب میں یہ ہے کہ

کوئی تاریخی واقعہ یا روایت:-

(۱) جسے رسول اللہ یا صحابہ کبارؓ کی طرف منسوب کیا جائے اور وہ قرآن کریم کے خلاف ہو، یا

(۲) اس سے حضورؐ رسالتمآب یا صحابہؓ کبار کی سیرت پر کسی قسم کا طعن پڑتا ہو۔

ہم اسے صحیح نہیں سمجھتے اس کے برعکس مودودی صاحب، ان کتابوں اور مجموعوں میں سے چُن چُن کر ایسے واقعات اور روایات نکالتے ہیں جن سے صدرِ اوّل کی تاریخ بھی نہایت گھناؤنی شکل میں سامنے آئے اور اسلام بھی اضحوکہ بن جائے اسی نہج کے مطابق انہوں نے اپنی کتاب "خلافت و ملوکیت" مرتب کی۔ اسی کے مطابق انہوں نے اپنی تفسیر لکھی۔ اسی کے مطابق سیرت نبویؐ کے متعلق انہوں نے وقتاً فوقتاً اپنے مضامین لکھے۔ انہوں نے پراپیگنڈہ کے زور پر "خلافت و ملوکیت" کو بھی خوب پھیلایا اور اپنی تفسیر کے متعلق یہ تاثر پیدا کرایا کہ اس ہزار سال کے عرصہ میں ایسی تفسیر نہ لکھی گئی ہے نہ لکھی جا سکتی ہے اور اب وہ اپنے ترکش کا آخری تیر چلانے پر تلے ہوئے ہیں جس کا ہدف حضورؐ رسالتمآب کی ذاتِ گرامی ہوگی۔ وہ اس میں چن چن کر ایسے واقعات درج کریں گے جن کا نمونہ آپ سابقہ اقتباسات میں دیکھ چکے ہیں۔ ہم نہ اس سے پہلے ان کا ہاتھ روک سکے تھے نہ اب روک سکتے ہیں لیکن چونکہ اب معاملہ اس ذاتؐ اقدس و اطہر کے متعلق آپڑا ہے جن کی عظمت و احترام محبت اور عقیدت ہمارا جزوِ ایمان ہی نہیں۔ ہماری ہستی کی دلیل اور ہمارے مسلمان کہلانے کی وجہِ جواز ہے۔ جن کے اسم گرامی کی طرف نسبت ہمارے لئے سعادتِ کونین اور متاعِ دارین ہے۔ جن کے وابستہ داماں ہونے سے ہم ایک مخصوص و مختص امت کے افراد ہونے کا شرف حاصل کرتے ہیں۔ اس لئے ہم ان کی منت کرتے ہیں کہ وہ اپنے اس عزم سے رُک جائیں۔ اس قسم کی کتاب شائع نہ فرمادیں۔ اس کے نتائج بڑے دور رس ہوں گے آپ ہمیں جس قدر جی چاہے گالیاں دے لیجئے۔ اس سے اگر آپ کو خوشی حاصل ہوتی، لذت ملتی ہے تو جتنا جی چاہے ہمیں ذلیل کر لیجئے۔ کیا مجال جو ہم ایک حرفِ شکایت بھی زبان تک لائیں۔ لیکن خدا کے لئے اس ذاتِ پاک کی عظمت کو بٹہ نہ لگائیے۔ اسے ہم برداشت نہیں کر سکتے۔ اسے کوئی مسلمان بھی برداشت نہیں کر سکے گا ——— اور یہ معاندین کے ہاتھ میں بہت بڑا حربہ دیدے گی۔

بقیہ تفہیم القرآن ص ۲۱ سے آگے مسلسل

حرفِ آخر

اس کے ساتھ ہی ہمارے اس لمبے سفر کی چھٹی اور آخری منزل ختم ہوتی ہے۔ کسی زمانے میں مودودی صاحب نے درخواست کی تھی کہ اگر کوئی صاحب علم تفسیر کے بارے میں ان کی فروگذاشتوں کی نشاندہی کر دیں تو وہ اس کے ممنون ہوں گے اور دوسرے ایڈیشن میں ان مقامات کی اصلاح کی کوشش کریں گے۔ ہم نے اپنی بساط کے مطابق ان غلطیوں کی نشاندہی کر دی ہے اور سنا ہے کہ انہوں نے تفسیر پر نظرِ ثانی کا کام بھی شروع کر دیا ہے۔ اسلئے اگر وہ ہماری اس ناچیز کوشش سے فائدہ اٹھا سکیں، تو اس سے ان کا اور ان کے ساتھ اور بہت سے لوگوں کا بھلا ہو گا والسّلام علیٰ مَنْ اتبع الھدیٰ۔ وَ آخرُ دعوانا اَنِ الحمدُ للہ ربِّ العالمین۔

طلوعِ اسلام کنونشن
منعقدہ نومبر ۱۹۶۷ء

قسط (۳)

مجلسِ مذاکرہ

موضوع

ہو فکر اگر خام تو آزادیِ افکار ○ انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

(۱۵)

عمارفی سلطانہ

صدرِ محترم و عزیزانِ گرامی قدر!

میں قرآن مجید کی طالبہ ہوں اس لئے موضوعِ مذاکرہ کا تجزیہ بنیادی طور پر قرآن ہی کی روشنی میں کرنا چاہتی ہوں۔ اس سلسلے میں پہلا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کیا قرآن نے انسانی عقل و فکر کو کوئی اہمیت بھی دی ہے۔ اگر اس نے اسے اہمیت دی ہے تو پھر قرآنی نقطۂ نظر سے یہ موضوع قابلِ غور ہوگا۔ لیکن اگر اس نے اسے کچھ اہمیت ہی نہیں دی تو پھر سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ پختہ فکر کیا ہوتی ہے اور فکرِ خام کیا، اور نہ ہی یہ سوال کہ پختہ فکر انسان کو کیا بنا دیتی ہے اور فکرِ خام کیا۔ اس سوال کی ضرورت اسلئے پیش آتی ہے کہ اسلام کو ایک مذہب سمجھا جاتا ہے اور مذہب کے متعلق یہ مسلّمہ ہے — خواہ وہ کوئی مذہب کیوں نہ ہو — کہ اس کے عقائد کو بلا سوچے سمجھے، آنکھیں بند کر کے مان لینا ہوتا ہے۔ اس میں عقل و فکر، غور و تدبر، دلیل و برہان کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب اور سائنس میں مستقل نزاع اور (FAITH) اور (REASON) میں مسلسل جنگ چلی آ رہی ہے لیکن اسلام مذہب ہے ہی نہیں — یہ دین ہے اور دین قانون (LAW) کو کہتے ہیں جس کی بنیاد ہی علم و بصیرت اور دلیل و برہان پر ہوتی ہے اور جس کی صداقت کی پرکھ اس کے نتائج کے ذریعہ کی جاتی ہے۔

میں فلسفہ کی بھی طالبہ ہوں۔ میں نے جب باباجی سے قرآن مجید پڑھنا شروع کیا تو یقین مانیے کہ میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ یہ ایک فلسفہ اور نفسیات (سائیکالوجی) کی کتاب ہے اور جوں جوں میرا مطالعہ قرآن بڑھتا گیا یہ تاثر بھی پختہ سے پختہ تر ہوتا گیا۔ قرآن نے مجھے پہلی وارننگ یہ دی کہ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (۱۷/۳۶) جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگ جایا کرو۔ اب سوچئے کہ یہ وارننگ کسی مذہبی کتاب کی ہو سکتی ہے۔ یا فلسفہ کی کتاب کی۔ پھر اس نے اتنا کہہ کر ہی بات ختم نہیں کر دی کہ ہم علم کی جو (DEFINITION) ہمارا جی چاہے کر لیں۔ اس نے اس کے ساتھ ہی کہہ دیا کہ یاد رکھو تمہاری سماعت، بصارت اور فوآد (MIND) سے پوچھا

جاتے گا کہ جس بات کو تم نے علم کہہ کر قبول کیا تھا کیا انہوں نے اس کی صداقت کی شہادت دی تھی۔

یہاں سے علم کی (DEFINITION) بھی متعین ہو گئی اور اس طرح اس نے انسان کو اس خود فریبی کے تاریک غاروں سے نکال لیا جس میں اُسے باطنیت نے یہ کہہ کر دھکیل رکھا تھا کہ لب بہ بند و چشم بند و گوش بند۔ آنکھیں بھی بند رکھو، کان بھی بند رکھو، زبان بھی بند رکھو تاکہ تمہیں علم باطنی حاصل ہو جائے۔ ایسا سمجھنے والوں کے متعلق قرآن نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ یہ اہل جہنم میں سے ہیں۔ سورۃ الاعراف میں ہے کہ تم دیکھو گے کہ مخلوق کی ایک کثیر تعداد اپنے جہنمی ہونے کا اعلان زبانِ حال سے کر رہی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں لیکن سمجھ سوچ سے کام نہیں لیتے۔ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان رکھتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ ان کی محض شکل و صورت انسانوں کی سی ہے۔ ورنہ یہ حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ بلکہ ان سے بھی پست سطح پر۔ (۷/۱۷۹) اسی تفصیل کو اس نے دوسری جگہ اس اجمال میں سمٹا دیا ہے کہ جب لوگ جہنم میں داخل ہو رہے ہوں گے تو جہنم کا داروغہ ان سے پوچھے گا کہ تم سے وہ کون سا ایسا سنگین جرم سرزد ہوا تھا جو تم جہنم میں دھکیل دیئے گئے ہو۔ وہ کہیں گے کہ ہمارا جرم یہ تھا کہ ہم نے عقل و فکر سے کام نہیں لیا تھا۔ لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ۔ (۶۷/۱۰) اگر ہم بات توجہ سے سنتے اور پھر عقل و فکر سے کام لیتے تو آج اہل جہنم میں سے کیوں ہوتے۔ اسی لئے اس نے دوسرے مقام پر کہا کہ ان لوگوں سے کہو کہ یہ دنیا میں چلیں پھریں۔ تاکہ ان کے دلوں کی کھڑکیاں کھلیں اور وہ سمجھنے سوچنے کے قابل ہو جائیں۔ ان کے کانوں سے ڈاٹ نکل جائیں اور ان میں سننے کی صلاحیت بیدار ہو جائے۔ ان کی آنکھوں پر پڑے ہوئے پردے اٹھ جائیں اور وہ دیدۂ بینا بن جائیں۔ ان سے کہہ دو کہ جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ تمہارے ماتھے کی آنکھیں اندھی ہو چکی ہیں۔ ماتھے کی آنکھیں اندھی نہیں ہوا کرتیں، وہ دل اندھے ہوا کرتے ہیں جو تمہارے سینوں میں مستور ہیں۔ اقبال کے الفاظ میں ؎

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب ✣ آنکھ کا نور دل کا نور نہیں!

دوسری طرف اس نے صاحبِ عقل و ہوش انسانوں کے متعلق کہا کہ جو لوگ عقل و بصیرت سے کام لیتے ہیں ان کے لئے کائنات کی تخلیق اور دن رات کی گردش میں قوانینِ خداوندی کی محکمیت اور ہمہ گیری کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ اُن صاحبانِ عقل و بصیرت کے لئے جو زندگی کے ہر گوشے میں کھڑے بیٹھے لیٹے قانونِ خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں اور کائنات کی تخلیقی ترکیب پر غور و فکر کرتے ہیں اور اپنی تحقیقات کے بعد علی وجہ البصیرت پکار اٹھتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (۳/۱۹۰) اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے اس کارگہ کائنات کو نہ تو عبث اور بیکار پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی نتائج مرتب کرنے کے لئے۔

قلتِ وقت مانع ہے ورنہ میں عزیزانِ گرامی قدر قرآن مجید کی سینکڑوں آیات پیش کر دیتی جن میں غور و فکر سے کام لینے کی تاکید کی گئی ہے جو آیات میں نے پہلے پیش کی ہیں ان میں صرف ایک کا اضافہ کر کے آگے بڑھ جانا چاہتی ہوں۔ میں نے شروع میں کہا ہے کہ مذہب کی دنیا میں ایمان (FAITH) سے مفہوم لیا جاتا ہے مذہبی مسلمات کو بلا سوچے سمجھے آنکھیں بند کر کے مان لینا۔ لیکن دیکھئے کہ قرآن کریم نے ایمان لانے والوں کے متعلق کیا کہا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں کہ اگر ان کے سامنے اور تو اور خود خدا کی آیات بھی پیش کی جائیں،

تو وہ انہیں اندھوں اور بہروں کی طرح تسلیم نہیں کرتے۔ غور و فکر کے بعد قبول کرتے ہیں۔ (۲۵/۷۳)

میں اس باب میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتی کہ مذہب کی دنیا میں جس بات کو FAITH کہا جاتا ہے قرآن کریم اُسے CONVICTION کہہ کر پکارتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ CONVICTION قلب و دماغ کے پورے پورے اطمینان کا نام ہوتی ہے۔ یہ ہے عزیزانِ من! قرآن کی رُو سے عقل و فکر کی اہمیت اور علم و بصیرت کا مقام۔

اب آگے بڑھیئے اور یہ دیکھئے کہ علامہ اقبال نے جو فکرِ پختہ اور فکرِ خام میں تفریق کی ہے تو اس سے ان کی مراد کیا تھی۔ اسے انہوں نے ایک قطعہ میں خود ہی واضح کر دیا ہے جب کہا ہے کہ

اس قوم میں ہے شوخیٔ اندیشہ خطرناک،
جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد!
گو فکرِ خداداد سے روشن ہے زمانہ
آزادیٔ افکار ہے ابلیس کی ایجاد

یعنی اُن کے نزدیک جو فکر ہر بند سے آزاد ہے وہ خام ہے۔ اس کی آزادی ابلیس کی ایجاد ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان حیوان بن کر رہ جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ "بند" کیا ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے عقل و فکر کام کرے تو انسان ملائکہ سے بھی بلند مقام حاصل کرے اور جب وہ ان بندشوں کو توڑ دے تو حیوانات سے بھی بدتر ہو جائے۔
اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ علم کا کوئی میدان بھی ہو کچھ حدود ایسی ہوتی ہیں کہ اگر انسانی فکر ان کے اندر رہتے ہوئے کارفرما ہو تو اس کے نتائج مثبت اور خوشگوار مرتب ہوتے ہیں۔ اگر وہ ان حدود سے اعراض برتے یا تجاوز کر جائے تو تخریبی نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ سائنس کی دنیا میں ان حدود کو (MAXIMS) یا بنیادی مسلمات کہا جاتا ہے۔ مثلاً قوانین فطرت (LAWS OF NATURE) بنیادی مسلمات ہیں جن کی حدود کے اندر رہتے ہوئے ایک سائنسٹ اپنی فکر میں آزاد ہوتا ہے۔ اگر وہ ان غیر متبدل قوانین کی حدود شکنی کرتا ہے تو اس کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔ یہ قوانین کسی سائنسٹ کے خود وضع کردہ نہیں ہوتے، خدا کے متعین کردہ ہوتے ہیں۔ یہ اس وقت بھی کائنات میں موجود تھے جب دنیا میں کسی سائنسٹ کا وجود نہیں تھا۔ سائنسی تحقیقات نے انہیں وضع نہیں کیا صرف DISCOVER کیا ہے۔ یعنی ان پر پڑے ہوئے پردوں کو اٹھایا ہے۔ نہ ہی سائنس دان ان بنیادی قوانین میں کسی قسم کی تبدیلی کر سکتے ہیں۔

فطرت کے یہ قوانین خارجی دنیا سے متعلق ہیں لیکن خود انسانی دنیا کے لئے بھی کچھ قوانین ہیں، انہیں مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ اگر انسانی فکر ان اقدار کے اندر رہتے ہوئے کام کرے تو اس کا نتیجہ نوعِ انسان کے لئے جنت بدوش ہوتا ہے اور اگر وہ ان حدود کو توڑ دے تو اس کا نتیجہ وہ جہنم ہے جس میں اس وقت ساری دنیا ماخوذ ہے۔
اصل یہ ہے کہ انسانی عقل و فکر کی بجائے خویش کوئی حیثیت نہیں۔ یہ انسانی مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ سوال سارا ان مقاصد کے تعین کا ہے۔ مستقل اقدار انسانی زندگی کے مقاصد کا تعین کرتی ہیں۔ اور انسانی فکر ان متعین شدہ مقاصد کے حصول کی تدابیر وضع کرتی ہے۔ عقل سے اس طرح کام لینے کا نتیجہ ایک فردوس بداماں انسانی

معاشرہ ہوتا ہے لیکن اگر انسانی زندگی کا مقصد مستقل اقدار متعین نہ کریں اور انسان کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو اس کی زندگی کا مقصد حیوانی جبلتوں (ANIMAL INSTINCTS) کی تسکین سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ اس صورت میں انسانی عقل پروفیسر جوڈ کے الفاظ میں انسان کے حیوانی جذبات کی لونڈی بن کر رہ جاتی ہے اور اس کی فکر اس کے جذبات کے پیچھے پیچھے یوں چلتی ہے جس طرح کتے کی ٹانگیں اس کی ناک کے پیچھے پیچھے چلتی ہیں۔ اس طرح یہ عقل بیباک' اقبالؒ کے الفاظ میں انسان کو حیوان بنانے کا ذریعہ بن جاتی ہے

اقبالؒ نے یہاں اتنا ہی کہا ہے کہ اس سے انسان حیوان بن جاتا ہے لیکن قرآن کریم اس سے بھی ایک قدم آگے جاتا ہے جہاں کہتا ہے کہ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۔ یہ لوگ حیوانات کی پست سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں بلکہ ان سے بھی پست تر سطح پر۔ سوال یہ ہے کہ یہ حیوانات سے بھی پست تر سطح کون سی ہے۔

حیوانات کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اپنی جبلتوں (INSTINCTS) کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ وہ نہ ان میں کوئی تغیر و تبدیل کر سکتے ہیں نہ کمی بیشی۔ شیر کو انگوروں کے باغ میں چھوڑ دیجئے۔ اس کی بے محابا قوت سے کسی ایک خوشے کو بھی ذرا سا نقصان نہیں پہنچے گا۔ بکری کو مرغی خانے میں کھلا چھوڑ دیں۔ کیا مجال جو کسی چوزے کو خراش تک بھی آجائے۔ شیر تاکستان میں اور بکری مرغی خانے میں بھوکوں مر جائینگے لیکن کیا مجال جن چیزوں کو جبلت نے ان پر حرام قرار دیا ہے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ جائیں۔ لیکن جب انسان حیوانی سطح پر اتر آتا ہے تو اس کے ہاتھوں نہ تاکستان محفوظ رہتا ہے نہ مرغی خانہ۔ نہ اسے حلال کی تمیز ہوتی ہے نہ حرام کی۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۔ یہ حیوان نہیں بلکہ ان سے بھی گیا گذرا ہو جاتا ہے۔

ایک اور گوشے کو بھی سامنے لائیے۔ شیر کی قوت کی کیا ٹھکانہ۔ لیکن فضا میں اڑنے والے چھوٹے چھوٹے پرندے بھی اس کی گرفت سے محفوظ ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ شیر کے اچھلنے کی ایک حد ہے جس سے آگے وہ جا ہی نہیں سکتا۔ لیکن انسان کی قوتوں کی کوئی حد نہیں۔ وہ فضا کی پہنائیاں تو ایک طرف چاند اور مریخ تک کو اپنی کمند میں لے آتا ہے۔ اس لئے جب وہ حیوانی سطح پر اترتا ہے تو اس کے ہاتھوں نہ فضا میں اڑنے والے محفوظ ہوتے ہیں نہ پانی کے اندر تیرنے والے۔ نہ میدان اس کی زد سے باہر ہوتے ہیں نہ پہاڑ اس کی ضرب سے مامون۔ نہ ہیروشیما کے بے گناہ شہری اس کے ہائیڈروجن بم کی زد سے محفوظ ہوتے ہیں نہ ویٹ نام کے پُرامن باشندے اپنے گھروں میں اس کے ہوائی حملوں سے مامون۔ نہ پاکستان کے ایک لاکھ جنگی قیدی اس کی خوئے درندگی اور خون آشامی کی سنگدلی سے بچ سکتے ہیں، نہ شکر گڑھ کے بیس لاکھ خانماں خراب اس کی جبلہ جوئی سے مصئون رہ سکتے ہیں۔

سوچئے کہ انسان کی یہ کیفیت بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۔ کی عبرت انگیز تصویر ہے یا نہیں اور اس فکری آزادی کو اگر ابلیس کی ایجاد نہیں کہا جائے گا تو اور کس نام سے پکارا جائے گا۔ قرآن کہتا ہے کہ جو لوگ اپنے حیوانی جذبات ہی کو اپنا خدا بنا لیں، ان کی عقل و فکر اسی قسم کے تباہ کن نتائج پیدا کیا کرتی ہے۔ اقبالؒ نے کہا ہے کہ یہ سب تباہیاں اس وجہ سے ہیں کہ یورپ کا دانشور عقل کو تابع فرمانِ نظر نہ کر سکا۔ اس نے اپنی فکر کو مستقل اقدارِ خداوندی کے تابع نہ رکھا۔

یورپ تو اس لئے تباہ ہوا لیکن سوال یہ ہے کہ ہماری تباہی کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہم نے

سرے سے عقل و فکر کا گلا ہی گھونٹ دیا۔ ہماری مذہبی پیشوائیت نے سوچنا سمجھنا حرام قرار دے دیا۔ اس کا فتویٰ ہے کہ اَوَّلَ مَنْ قَاسَ اِبْلِیْسُ. جس نے سب سے پہلے عقل و فکر سے کام لیا وہ ابلیس تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری ساری تاریخ اسی داستانِ جگر خراش کا عبرتناک مرقع ہے کہ جس شخص نے عقل و فکر کی بات کی اسے حوالہ دار و رسن کر دیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ہمارے ہاں صحیح آواز اس گروہ نے اٹھائی جس نے کہا تھا کہ دین نام ہے قرآن کی روشنی میں عقل و فکر سے کام لینے کا۔ عقل کے دشمنوں نے اسے کفر اور ارتداد قرار دیا اور انہیں چن چن کر ذبح کیا گیا۔ اور ان کی تحریروں کا ایک ایک ورق ڈھونڈ کر نکالا گیا اور اسے نذرِ آتش کیا گیا۔

رینان کا بیان ہے کہ ایک قاضی کے کتب خانہ میں جس قدر فلسفہ کی کتابیں تھیں۔ خاص کر ابن سینا اور اخوان الصفا کی تصنیفات، ان سب کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ طبیب عبدالسلام پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا اور اس کا کتب خانہ جلا دیا گیا۔ فخرالدین ابن الخطیب رازی پر بغداد میں مصائب ٹوٹ پڑے کیونکہ وہ محققانہ فلسفہ کا پیرو تھا۔ اسکے انتقال کے بعد اس کے مکان میں ایسے اشعار پائے گئے جن میں فلسفیانہ مضامین تھے۔ لوگوں کو معلوم ہوا تو اس کی قبر کھود کر اس کی خاک اڑا دی گئی۔ ابن حبیب کو اس لئے سولی پر لٹکوا دیا گیا کہ وہ فلسفہ پڑھاتا تھا۔ محمد بن احمد جو بہت بڑے معتزلی تھے، پچاس برس تک اپنے گھر سے باہر نہ نکل سکے۔ ان کے گھر سے ان کا جنازہ ہی نکلا۔ علامہ زمخشری جن کی تفسیر کشاف آج ہر کتب خانہ کی زینت ہے، اپنے ملک میں چین سے نہ رہنے پاتے تو ہجرت کر کے مکہ چلے گئے۔ اس زمانہ میں نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ جب یہ کہا جاتا کہ فلاں شخص فلسفہ پڑھتا ہے تو قبل اس کے کہ بات کسی عدالت تک پہنچے لوگ خود ہی اسے پتھر مار مار کر ہلاک کر دیتے تھے یا آگ میں جلا دیتے تھے۔ خلیفہ معتضد باللہ عباسی نے اپنے تخت نشین ہونے کے ساتھ ہی یہ اعلان کر دیا تھا کہ کوئی کتب فروش فلسفہ کی کتب نہ بیچے۔

یہ ہیں مختصر سے کوائف اس حقیقت کی شہادت کہ ہماری مذہبی پیشوائیت نے کس طرح انسانی فکر کا گلا گھونٹا۔ ان کی یہ علم دشمنی عہدِ ماضی تک ہی محدود نہ تھی۔ ابھی کل کی بات ہے کہ ہمارے ہاں سرسید نے عقل کی باتیں کرنا شروع کیں تو انہیں نیچری کہہ کر مرتد قرار دے دیا گیا۔ اور ان کے خلاف مکہ اور مدینہ تک سے کفر کے فتویٰ منگائے گئے۔ پھر ان کے خلاف پراپیگنڈہ کی مہم اس قدر شدید کی گئی کہ نیچری کا لفظ کفر و الحاد کے مترادف قرار دیا گیا۔ اور میں کہتی ہوں کہ ہمیں سرسید کے زمانے کی طرف بھی جانے کی کیا ضرورت ہے۔ خود ہماری آنکھوں کے سامنے ایک عظیم مفکر بیٹھا ہے جس کی ساری عمر قرآنی حقائق پر غور و فکر میں گزری ہے اور جس کی شب زندہ داریوں اور جگر کاویوں کے تصدق میں میرے جیسے ہزاروں مذہب سے برگشتہ طالبِ علم خدا کی اس کتابِ عظیم کے گرویدہ ہو چکے ہیں، لیکن اس مفکر کے خلاف کیا کچھ نہیں کیا گیا۔ ان کے خلاف ایک ہزار علماء کرام نے کفر کا فتویٰ صادر کیا۔ اور اس مسلسل اور منظم پراپیگنڈہ کا یہ اثر ہے کہ جس شخص کو مذہب سے کوئی تعلق نہیں جس نے کبھی اسلام کے متعلق ایک لفظ تک نہیں پڑھا۔ اس کے سامنے بھی پرویز کا نام لے لیا جائے تو اس کے ماتھے پر شکن پڑنے لگ جاتی ہے اور اس کی آنکھوں سے نفرت اور حقارت کی چنگاریاں نکلنی شروع ہو جاتی ہیں۔ یہ ہے جو کچھ مذہبی پیشوائیت آج بھی فکر و بصیرت کا نام لینے والوں کے خلاف کرتی ہے اور اس کے باوجود اس قرآن پر ایمان رکھنے کے مدعی بھی ہے۔ جو عقل و فکر سے کام نہ لینے والوں کو اہلِ جہنم قرار دیتا ہے۔ جہاں تک میں نے غور کیا ہے، بلکہ میں یہ کہوں گی کہ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ ہمارے نوجوان

تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں فکری حدود کے خلاف جو اس قدر جذبات سرکشی ابھر رہے ہیں وہ ردعمل ہیں ہماری مذہبی پیشوائیت کی اس روش کا جس کی رُو سے اس نے عقل و فکر کو حرام قرار دے رکھا ہے۔ ان رہزنانِ دین و دانش کو کون بتائے کہ (لاک کے الفاظ میں)

> جو شخص وحی کے چراغ روشن کرنے کے لئے عقل کے دیئے بجھا دیتا ہے وہ وحی اور عقل دونوں کے چراغ گل کر دیتا ہے۔

یہ وہ مقام ہے جہاں ہم اس وقت کھڑے ہیں۔ ہمارے سکولوں اور کالجوں کی تعلیم ہمارے نوجوانوں کے دماغ میں فکرِ خام کی حدت سے سرسام پیدا کر رہی ہے اور ہمارے مکتب اور دار العلوم اپنی کو رنگہی سے دل و دماغ دونوں کو مفلوج کر رہے ہیں۔ اسلئے

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی
اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر،
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام

مردہ لادینیٔ افکار سے افرنگ میں عشق
عقل بے ربطیٔ افکار سے مشرق میں غلام

ان حالات میں ہماری امیدوں کا مرکز اس مردِ درویش کے تصور کی وہ درس گاہ تھی جس میں یہ وحی اور عقل کے امتزاج سے تازہ شمعیں روشن کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے سامنے بھی زمانے کے حالات روک بن کر کھڑے ہو گئے۔ بہرحال وہ درسگاہ جلدی وجود میں آجائے یا دیر میں، اس لادینیٔ افکار کا علاج اس کے سوا کہیں اور نہیں مل سکے گا۔ خدا اس پیر جواں ہمت کو عمر دراز عطا فرمائے۔

(۔۔۔)

ضرورت رشتہ

ایک نیک سیرت، سلیقہ شعار دوشیزہ۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ایڈ۔ سینئر ٹیچر۔ عمر ۲۷ سال۔ تنخواہ -/۳۷۵ روپے ماہوار کے لئے، پاکیزہ، اسلامی نظریات کے حامل نوجوان کا رشتہ درکار ہے۔

خط و کتابت:۔ غ۔م معرفت ادارۂ طلوعِ اسلام
۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

خط لکھیئے — علمی۔ ادبی اور اسلامی — کتب و رسائل منگانے کے لئے —

پتہ:۔ مینیجر اے۔ بی۔ سنٹر، 21/E، مین مارکیٹ، گلبرگ۔ لاہور

بصیرت افروز و انقلاب آفریں کتابیں

قائدِ اعظمؒ کے تصوّر کا پاکستان

پرویز صاحب کے قلم سے یہ کتاب حال ہی میں شائع ہوئی ہے جس میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ ● پاکستان کی بنیاد کیا تھی؟ ● بانیٔ پاکستان اقبالؒ اور معمارِ پاکستان قائدِ اعظمؒ نے اس مملکت کا تصوّر کیا دیا تھا؟ ● دو قومی نظریہ کیا ہے ● نظریۂ پاکستان کبھی فیل ہوا ہے نہ کبھی فیل ہو سکتا ہے ● پاکستان اب بھی ایک قابلِ فخر ملک بن سکتا ہے۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ اس کا ایک نسخہ ہر اُس گھر میں ہو جس کے بچے تعلیم حاصل کر رہے ہوں یا کر چکے ہوں

قیمت:۔ بارہ روپے (علاوہ محصولڈاک)

قرآنی فیصلے

زندگی کے بیسیوں مسائل اور معاشرے کے معاملات کے متعلق قرآن کے احکام کیا ہیں؟ اور ہم کیا کرتے ہیں؟ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، صدقات، خیرات، قربانی، ترکہ، وصیت۔ نکاح، طلاق، اوقاف، شراب، جوا، حرام و حلال یا مثلاً شبِ برات۔ عید میلاد۔ تصویر کشی، موسیقی، سینما، مشاعرے۔ عذابِ قبر، نبی اکرمؐ و علمِ غیب۔ حضورؐ کا معراج۔ الہام۔ مرکزِ ملت۔ غلام اور لونڈیاں وغیرہ جن کے متعلق قرآن کے فیصلے کا آپ کو علم نہیں ان کے بارے میں سب کچھ آپ کو ایک جگہ اس کتاب میں مل جائے گا

قیمت:۔ مکمل سیٹ تین جلد ۔ پندرہ روپے ۔ فی جلد پانچ روپے (علاوہ محصولڈاک)

قرآنی قوانین

ایک مختصر لیکن جامع کتاب جو عام طبقے کے علاوہ جج صاحبان اور وکلاء حضرات کے لئے بڑی مفید ثابت ہوئی ہے۔ اس میں ان تمام احکام کو مرتب کر دیا گیا ہے جو قرآن کریم میں بطور قوانین دیئے گئے ہیں علاوہ ازیں ان مستقل اقدار کو بھی مدوّن کر دیا گیا ہے جن کی روشنی میں اُمّت عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق خود جزئی قوانین مرتب کرے گی۔

(قیمت:۔ چار روپے۔ (علاوہ محصولڈاک)

تاریخ الاُمّت

قرآنی فکر و بصیرت کے حامل جہاں دیدہ مورخ علامہ اسلم جیراجپوری کے قلم سے اُمت کی تمام سرگزشت مختصر سلیس اور سادہ انداز میں جسے ادارہ نے بڑی محنت سے شائع کیا ہے اور کئی درس گاہوں میں شاملِ نصاب ہے۔ آٹھ جلدوں کے عنوانات حسبِ ذیل ہیں (۱) سیرتِ رسولؐ۔ (۲) خلافتِ راشدہ (۳) خلافتِ بنی اُمیّہ (۴) خلافتِ بنی اُمیہ ۔(۵) خلافتِ عباسیہ (بغداد) (۶) تاریخِ مصر۔(۷) آلِ عثمان (۸) ہندی تاریخ پر عام تبصرہ۔ قیمت مکمل سیٹ پچیس روپے۔ جلد پنجم ۔ چار روپے ۔ بقیہ فی جلد تین روپے (علاوہ محصولڈاک)

جہانِ فردا

اس سوال کا جواب کہ مرنے کے بعد کیا ہو گا؟ مفکرِ قرآن جناب پرویز نے اپنی مدت العمر کے غور و فکر کے بعد اس معرکۃ الآرا تصنیف میں صاف سادہ لیکن دلکش انداز میں پیش کر دیا ہے۔ یہ کتاب بڑی مفید۔ بصیرت افروز در حقیقت کتاب ہے جس میں موت و حیات، برزخ، حشر، نشر، قیامت، حساب کتاب، اعمال نامہ، میزان، جنت، دوزخ اور حیات جاوداں تمام مباحث آ گئے ہیں۔ قیمت آٹھ روپے (ارزاں ایڈیشن) علاوہ محصولڈاک۔

ملنے کا پتہ

مکتبہ دین و دانش چوک اُردو بازار لاہور ◆ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

ظالم پنپ نہیں سکتا

"ان کی تباہی پر نہ آسمان رویا نہ زمین
کی آنکھ نم آلود ہوئی" ____ (القرآن العظیم)

____ پرویز

> قریب سات سال پہلے کا ذکر ہے اس موضوع پر پرویز صاحب کا ایک مبسوط مقالہ شائع ہوا تھا۔ اس دوران میں دنیا میں ظلم بڑھتا چلا گیا۔ اور آج اس بدنصیب کرۂ ارض کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں ظلم کا دور دورہ نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ جس وسعت، شدت گیرائی اور گہرائی سے یہ آج نوعِ انسان پر مسلط ہے تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ بنابریں ضرورت ہے کہ اس سلسلہ میں قرآن کریم کے حقائق اور اس کی تنبیہات و تنذیرات کو بار بار سامنے لایا جائے بالخصوص اپنی قوم کے سامنے جو قرآن کریم پر ایمان کی مدعی ہے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر اس مقالہ کو بعد نظر ثانی درج مجلہ کیا جاتا ہے۔ ____ طلوعِ اسلام

دو ذہنیتوں کا فرق قابلِ غور ہے۔

ایک شخص یہ سمجھتا ہے کہ اگر میں ایسا انتظام کر لوں کہ قانون کی گرفت میں نہ آسکوں، یا اگر اس کی گرفت میں آ بھی جاؤں تو اپنے اثر و رسوخ، سفارش، رشوت سے مواخذہ سے بچ جاؤں تو پھر مجھے کسی کی پرواہ نہیں، میں جس پر چاہوں، ظلم و زیادتی کروں جن طریقوں سے چاہوں اپنے مفاد حاصل کروں، جس قانون کی جی چاہے، خلاف ورزی کروں، جس قسم کی چاہوں دھاندلی مچاؤں، میں اپنے ہر مقصد میں کامیاب رہوں گا۔ اور مجھے کسی قسم کا خوف و خطرہ نہیں ہو گا۔ اسی طرح ایک قوم سوچتی ہے کہ اگر میں اپنے ہاں کافی قوت جمع کر لوں، تو پھر جس قوم کا جی چاہے گلا دبا دوں، جسے چاہوں اپنا غلام بنا لوں، جس پر چاہوں ظلم و استبداد کروں، ہر طرح کی کامیابیاں اور کامرانیاں میرے حصے میں آئیں گی۔ مجھے کسی سے کوئی ڈر اور خوف نہیں ہو گا۔

لیکن ایک اور شخص (یا قوم) ہے جسے ہر طرح کی قوت حاصل ہے۔ اس کا اثر و رسوخ بھی کافی ہے، دولت اور

ذرائع کی بھی کمی نہیں، اسے دوسروں پر ظلم و زیادتی کرنے کے تمام مواقع حاصل ہیں۔ اسے جائز و ناجائز طریق سے مال و دولت حاصل کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ لوٹ کھسوٹ اور سلب و نہب کی کوئی بازپرس نہیں کر سکتا۔ غرضیکہ دنیا میں کوئی قوت ایسی نہیں جو اس کا ہاتھ روک سکے یا گلا دبا سکے۔ اس کے گرد و پیش افراد (یا اقوام) دن دہاڑے ناانصافیاں کرتے اور (بظاہر) پھولتے پھلتے چلے جاتے ہیں لیکن اس کے سامنے زندگی کا ایک محکم نظریہ، ایک اٹل قانونِ حیات، ایک غیر متبدل کلیہ ہے جس کی صداقت پر اسے یقین کامل ہے۔ یعنی یہ کہ

إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ (۶/۲۱)

یاد رکھو! ظلم کرنے والا کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ظالم کی کھیتی پروان نہیں چڑھ سکتی، وہ کبھی پنپ نہیں سکتا۔

اس نظریۂ زندگی، اس قانونِ حیات، اس محکم کلیہ پر اس کا ایمان، ظلم و جور، استبداد کے ہر قسم کے ذرائع، اور مواقع کے باوجود، اسے کبھی ظلم و جور پر آمادہ نہیں کر سکتا۔ لوگ اس سے کہتے ہیں، کہ تم کس فریب میں مبتلا ہو؟ دیکھتے نہیں کہ لوٹ کھسوٹ کرنے والے کس طرح دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرتے چلے جاتے ہیں۔ ایسے مواقع روز روز نہیں آتے۔ لیکن وہ اس ترغیب و تحریص کے باوجود، کامیابی کے لئے کوئی ناجائز طریقہ اختیار نہیں کرتا۔ اور اپنے ناصح مشفق سے بخفیف تبسم کہہ دیتا ہے۔ کہ جسے تم ان کی ترقی سمجھ رہے ہو۔ یہ سب چھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا (۶/۴۵)

ظلم کرنے والی قوم کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

زندگی کا یہ قانون اٹل ہے کہ هَلْ يُهْلَكُ إِلَّا الْقَوْمُ الظَّالِمُونَ (۶/۴۷) ظالم قوم کی تباہی یقینی ہے۔ وہ زندگی کی شادابیوں اور خوشگواریوں سے محروم رہ جاتی ہے۔

لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ ۔ (۷/۴۴)

اوّل الذکر ذہنیت کا نام ہے ——— خدا سے انکار ——— اسے کفر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی خدا کے ابدی قوانین کی صداقت سے انکار بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ زبان سے اس کا اقرار کرتی ہے یا نہیں ——— اور ثانی الذکر ذہنیت کو خدا پر ایمان کہتے ہیں اور اس قسم کا ایمان رکھنے والوں کو قرآن کی زبان میں مومن اور مسلم کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

آیئے! ہم دیکھیں کہ ہمارا شمار کس گروہ میں ہوتا ہے۔

ظلم کسے کہتے ہیں؟

اس مقصد کے لئے سب سے پہلے، یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ظلم کہتے کسے ہیں؟ اس کے معانی کیا ہیں اور مفہوم کیا؟

لفظ ظلم کے بنیادی معنی "کمی کرنے" کے ہیں۔ یعنی کسی کے حقوق و واجبات میں کمی کرنا۔ اسے وہ کچھ، اور اتنا نہ دینا جس کا وہ حقدار ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں ہر قسم کی ناانصافی، جور، استبداد، قانون کی خلاف ورزی اور سرکشی آ جاتی ہے۔ لیکن امام راغبؒ نے اس (لفظ) کی ایک ایسی تعریف (DEFINITION) دی ہے جو اس کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔ یعنی ظلم سے مراد ہے۔

کسی شے کا اس مقام پر نہ ہونا جس مقام پر اسے ہونا چاہیئے۔
اسی سے لفظ "ظلمت" آتا ہے۔ جس کے معنی ہیں ــــــ جس مقام پر روشنی ہونی چاہیئے تھی۔ وہاں روشنی کے بجائے تاریکی ہونا۔

یہ تو ہوئے اس کے لغوی معنی۔ لیکن قرآن کریم، اس کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں کو اس صراحت اور وضاحت سے سامنے لایا ہے کہ ان کی روشنی میں، اس جامع حقیقت کے سمجھنے میں کوئی دشواری ہی نہیں رہتی کہ ظلم کسے کہتے ہیں۔ اور ظالم کون ہوتا ہے۔

شرک سب سے بڑا ظلم ہے

سب سے پہلے وہ ظلم کے ایک ایسے گوشے کو سامنے لاتا ہے۔ جس کی طرف کسی کی نگاہ ہی نہیں اٹھ سکتی تھی۔ آپ نے کبھی کسی کو یہ کہتے نہیں سنا ہوگا کہ شرک، ظلم ہے اور مشرک ظالم ہوتا ہے۔ لیکن قرآن کا اعلان ہے کہ شرک "ظلم ہی نہیں بلکہ "ظلم عظیم" ہے (۳۱/۱۳) یہ نکتہ غور سے سمجھنے کے قابل ہے۔

قرآن کریم کی رو سے توحید (یعنی ایک خدا کو ماننے) سے مراد یہ ہے کہ انسان، صرف قوانین و احکام خداوندی کی اطاعت کرے، اس کے سوا کسی اور کی اطاعت نہ کرے۔ اگر اس نے، خدا کے علاوہ کسی اور کے احکام و قوانین کی اطاعت کی، تو اس نے گویا، اس شخص (یا قوت) کو اس اقتدار و اختیار میں شریک کر لیا جو صرف خدا کے لئے مختص تھا۔ اس سے یہ شخص (یا قوت) اس مقام پر جا بیٹھا جس مقام پر اسے نہیں رہنا چاہیئے تھا۔ اس سے بڑا شرک اور کیا ہوگا!

دوسری طرف اس انسان کو لیجئے جو شرک کا مرتکب ہوتا ہے۔ خدا نے انسان کو کائنات میں سب سے بلند مقام عطا فرمایا ہے اس نے کہا ہے کہ ــــــ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۔ (۴۵/۱۳) "جو کچھ زمین و آسمان میں ہے، خدا نے اس سب کو تمہارے لئے تابع تسخیر کر دیا ہے" یہ تو رہا خارجی کائنات کے متعلق۔ باقی رہے دوسرے انسان، تو اس نے کہا ہے کہ ــــــ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) ہم نے تمام انسانوں کو یکساں طور پر واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ اب اگر ایک انسان، خارجی کائنات کی کسی قوت کے سامنے جھکتا ہے تو وہ اپنے سے ادنیٰ شے کو، اپنے سے زیادہ عظمت کا مستحق قرار دیتا ہے اور اگر کسی انسان کے احکام کے سامنے جھکتا ہے تو یہ اپنے جیسے انسان کو اپنا حاکم قرار دیتا ہے۔ اس کا یہ عمل، دونوں صورتوں میں شرف انسانیت کی تذلیل کا موجب ہے اس نے اپنے آپ کو اس مقام پر نہیں رکھا جس مقام پر انسان ہونے کی حیثیت سے اُسے ہونا چاہیئے اور یہ بہت بڑا ظلم ہے۔

شرک کی پہلی صورت اگر خدا کے خلاف شرک تھا تو دوسری صورت، خود انسان کی اپنی ذات کے خلاف شرک ہے اور یہ "ظلم عظیم" ہے۔

شرک (ظلم عظیم) کی اس شکل کو سامنے رکھیئے اور پھر دیکھئے کہ ہم میں سے کتنے ہیں۔ جو اس جرم کے مرتکب نہیں ہو رہے ــــــ زندہ انسان تو ایک طرف ہماری ذلت کی انتہا ہے کہ ہم مردہ انسانوں تک کے حضور جھکتے اور گڑگڑاتے ہیں اور ہر سانس میں غیر خداوندی احکام و قوانین کی اطاعت کرتے ہیں۔ (یاد رکھیئے! خدا کی عبادت

کے معنی خدا کی اطاعت ہیں۔ یعنی اس کے احکام و قوانین کی اطاعت کرنا)

یہاں تک تو شرک (یعنی ظلم عظیم) کی اس نوع کا ذکر تھا جس میں انسان کسی دوسرے کی محکومیت اختیار کرتا ہے۔ لیکن قرآن کریم اس باب میں، ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر خدا کے احکام و قوانین کے خلاف، تم اپنے جذبات و خواہشات کے پیچھے چلنے لگ جاؤ تو یہ بھی شرک ہے۔ تمہارے جذبات کا صحیح مقام یہ ہے کہ ان سے، قوانین خداوندی کی روشنی میں کام لیا جائے، نہ یہ کہ انہیں اپنے آپ پر مسلط کر لیا جائے۔ یہ بھی ظلم ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے۔

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اَهْوَاءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ (۳۰/۲۹)

یہ ظالم، وحی کی روشنی کے بغیر، اپنے جذبات کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔

بظاہر یہ بات سمجھ میں نہیں آئے گی کہ اتباعِ جذبات کو ظلم سے کیوں تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن بادنیٰ تعمق یہ حقیقت سامنے آ جائے گی کہ ظلم و تعدی کی بنیاد ہی اس پر ہے کہ انسان قوانین خداوندی کو چھوڑ کر، اپنی من مانی کرنے لگ جائے۔ اسی کو "اتباعِ جذبات بغیر علم" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جو شخص، اپنے جذبات و خواہشات کو وحی کے تابع رکھے، اور یوں تمام معاملات کے فیصلے، قوانینِ خداوندی کے مطابق کرے، اس سے ظلم سرزد ہو نہیں سکتا۔

ظالم حکومت یہی چیز جب انفرادی زندگی سے آگے بڑھ کر، انسانوں کی اجتماعی زندگی سے متعلق ہو جائے، تو اس وقت یوں کہا جائے گا کہ عدل و انصاف پر مبنی حکومت وہی کہلا سکتی ہے جس میں تمام امور کے فیصلے قوانین خداوندی کے مطابق ہوں۔ جو نظام مملکت، قوانینِ خداوندی کے مطابق قائم نہ ہو، قرآن کریم اسے ظالم کہہ کر پکارتا ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ (۵/۴۵)

جو حکومت، وحی خداوندی کے مطابق فیصلے نہیں کرتی، تو یہی لوگ ہیں۔

جنہیں ظالم کہا جاتا ہے۔

منافقت ایک انداز یہ بھی ہوتا ہے کہ جب دیکھا جائے کہ خدا کے کسی حکم یا قانون کے مطابق فیصلہ لینے میں فائدہ ہوتا ہے، تو اس کی اطاعت اختیار کر لی جائے، لیکن جو قانون اپنے خلاف جاتا ہو، اس سے اعراض برتا جائے۔ قرآن کریم اس منافقانہ طرزِ زندگی کو بھی ظلم سے تعبیر کرتا ہے۔ جب وہ کہتا ہے کہ۔

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو زبان سے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں اور ان کی اطاعت بھی کرتے ہیں لیکن اس کے بعد ان کا ایک گروہ اس اطاعت سے روگردانی اختیار کر لیتا ہے۔ یہ درحقیقت مومن ہیں ہی نہیں۔

اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ جب انہیں اس نظام کی طرف بلایا جاتا ہے جسے خدا کے رسول نے احکام خداوندی نافذ کرنے کے لئے قائم کیا ہے۔ تاکہ وہ

ان کے متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ کرے، تو وہ گروہ اس سے اعراض برتتا ہے لیکن اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ فیصلہ ان کے حق میں ہو گا تو وہ اس کی اطاعت کے لیئے لبیک کہہ آتے ہیں ...... اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۲۴/۴۷-۵۰)

یہ لوگ بھی ظالم ہیں۔

غلط نظریۂ زندگی

اصل یہ ہے کہ اس قسم کا منافقانہ انداز اختیار ہی، وہ کرتا ہے جسے صحیح نظریۂ زندگی پر ایمان نہ ہو۔ نظریۂ زندگی ہی (جسے قرآن کلمہ کہہ کر پکارتا ہے۔ اور دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں جسے آئیڈیالوجی کہا جاتا ہے) انسانی عمل کے غلط یا صحیح ہونے کا معیار ہوتا ہے۔ غلط نظریۂ زندگی کو نہ خود ثبات ہوتا ہے، نہ ہی اس بنیاد پر اٹھی ہوئی عمارتِ اعمال استوار ہو سکتی ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے غلط نظریۂ زندگی کے حاملین کو بھی ظالم کہہ کر پکارا ہے۔ سورۂ ابراہیم میں ہے۔

صحیح نظریۂ زندگی کی مثال ایک ایسے عمدہ پھلدار درخت کی سی ہے جس کی جڑیں پاتال میں، محکم و استوار ہوں اور اس کی شاخیں فضائے آسمانی میں جھومتے جھول رہی ہوں۔ وہ درخت، قانونِ خداوندی کے مطابق، ہر زمانے میں، ہر موسم میں، پھل دیئے جاتا ہے۔ اس طرح اللہ بسیط حقائق کو محسوس مثالوں کے ذریعے واضح کر دیتا ہے تاکہ لوگ انہیں اچھی طرح سمجھ جائیں۔

اس کے برعکس، غلط نظریۂ زندگی کی مثال ایک ایسے نکمے درخت کی سی ہے۔ جس کی کھوکھلی سی جڑ، زمین کے اوپر ہی اوپر ہو، کہ اسے جب جی چاہے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔

اس طرح خدا، اس محکم نظریۂ زندگی کی رُو سے، ایمان والوں کی جماعت کو، ان کی دنیاوی زندگی میں بھی ثبات و تمکن عطا کر دیتا ہے اور اُخروی زندگی میں بھی۔ اس کے برعکس غلط نظریۂ زندگی کے حامل (ظالمین) کی تمام کوششیں رائیگاں جاتی ہیں اور یہ سب کچھ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ (۱۴/۲۴-۲۷)

دو نظریاتِ حیات

ایک نظریۂ زندگی یہ ہے کہ انسان صرف اس کے طبیعی جسم کا نام نہیں۔ اس میں ایک اور چیز بھی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے۔ جسم کی پرورش اور آسائش اس لئے ضروری ہے کہ زندگی کی موجودہ سطح پر یہ اس کی ذات کا مرکب ہے اور اس کے فیصلوں کو بروئے کار لانے کا ذریعہ۔ زندگی کا حقیقی مقصود انسانی ذات کی نشوونما ہے اس لئے انسان جو کام بھی کرے اسمیں دیکھنا یہ چاہیئے کہ وہ کس حد تک اسکی ذات کی نشوونما کیلئے ممد و معاون ہو سکتا ہے جس عمل کا جذبہ محرکہ یہ ہو اسے ثبات و قرار ہوتا ہے کیونکہ وہ گویا اسکی ذات کا جزو بن جاتا ہے جو جسم کی موت کے ساتھ فنا نہیں ہو جاتی۔

اس کے برعکس دوسرا نظریہ یہ ہے کہ زندگی بس اسی جسم کی زندگی ہے۔ اس کے خاتمہ پر خود انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نظریۂ زندگی کا حامل جو کچھ کرے گا، اس لئے کرے گا کہ اسے جسم کی پرورش و آسائش کا سامان ہاتھ آجائے۔ اگر وہ کوئی ایسا کام بھی کرے گا جسے عام اصطلاح میں "نیکی" کہا جاتا ہے۔ تو اس کا جذبہ

محور اپنی نمود و نمائش ہو گا جس سے انسان کے ایگو کی تسکین ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے اعمال کے لئے بقا نہیں ہو سکتی۔ قرآن کریم نے اسے "اپنی ذات پر ظلم" سے تعبیر کیا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے۔

> ایسے لوگوں کے پیشِ نظر صرف طبیعی زندگی کی آسائشیں ہوتی ہیں۔ اس مقصد کے لئے جو کچھ صرف کیا جاتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے شدت کی سرد ہوا چلے اور ان لوگوں کی کھیتی تک جا پہنچے، جنہوں نے قانونِ خداوندی کے مطابق اس کی حفاظت کا سامان نہیں کر رکھا، تو یہ ہوا ان کی کھیتی کو تباہ کر دے گی۔ یہ اس لئے ہوا کہ انہوں نے اپنے آپ پر ظلم کر رکھا تھا۔ یاد رکھو! خدا کسی پر ظلم اور زیادتی نہیں کرتا، لوگ خود اپنے آپ پر ظلم اور زیادتی کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ بھگتتے ہیں۔ (۳/۱۱۶)

غلط معاشی نظام

ظلم کا عام مفہوم یہ ہے کہ دوسروں کے واجبات پورے پورے ادا نہ کئے جائیں۔ ان کے حقوق کو اتلاف کیا جائے۔ دوسروں کا مال ناجائز طور پر کھایا جائے دوسروں کی محنت کی کمائی پر تن آسانی اور عیش سامانی کی زندگی بسر کی جائے۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ یہ سب خرابیاں غلط معاشی نظام کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اس لئے غلط معاشی نظام، بجائے خویش بہت بڑا ظلم ہے اور اس قسم کے نظام کے حامل سب سے بڑے ظالم۔ قرآن کریم میں معاشیات کے متعلق اس قدر وضاحت اور کثرت سے آیا ہے کہ ضمنی طور پر اس کا احاطہ ممکن نہیں۔ (میں اس سلسلہ میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں) اس لئے اس مقام پر اس کے صرف دو ایک گوشوں کو سامنے لایا جائے گا۔ مثلاً سورۃ النحل میں ہے۔

> قوموں پر تباہیاں کیوں اور کب آتی ہیں، اسے ایک مثال سے سمجھو۔ ایک بستی تھی جسے خارجی خطرات کی طرف سے امن اور داخلی کشمکش سے اطمینان حاصل تھا۔ اس کی طرف ہر سمت سے سامانِ رزق کھنچا چلا آتا تھا۔ اس کے رہنے والے بڑے خوشحال اور فارغ البال تھے۔ لیکن انہوں نے خدا کی ان بخششوں کی ناقدرشناسی کی۔ (بڑے بڑے لوگوں نے انہیں اپنے لئے سمیٹنا اور چھپانا شروع کر دیا۔) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر بھوک اور خوف کا عذاب طاری ہو گیا۔ یہ سب کچھ ان کے اپنے ہاتھوں کا ساختہ پرداختہ تھا۔
>
> ان کے پاس خود انہی میں سے خدا کا ایک پیغامبر آیا۔ لیکن انہوں نے اسے جھٹلایا تو ان پر ہلاکت کا عذاب مسلط ہو گیا۔
>
> اور یہ سب اس لئے ہوا کہ هُمْ ظَالِمُوْنَ وہ ظالم تھے۔ (۱۶/۱۱۲-۱۱۳)

اسی قسم کی مثال اس نے سورۂ کہف (آیات ۳۲-۴۳) میں بھی دی ہے اور تباہ ہونے والے کے متعلق کہا ہے کہ هُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ۔ اس نے اپنے آپ پر ظلم کیا تھا۔ جس کا نتیجہ تباہی اور بربادی

کی شکل میں سامنے آیا۔

ننانویں دنبیاں

غلط معاشی نظام کی ایک بنیادی خرابی یہ ہوتی ہے کہ اس میں بڑا سرمایہ، چھوٹے سرمایہ کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ میں غریب، غریب تر اور امیر، امیر تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ظلم کی یہ وہ شق ہے جسے قرآن کریم نے، حضرت داؤد علیہ السلام کے تذکرہ کے سلسلہ میں یوں بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ ان کے پاس دو شخص اپنا مقدمہ لے کر آئے۔

> مستغیث نے کہا کہ فریق ثانی میرا بھائی ہے۔ اس کے پاس ننانویں دنبیاں ہیں اس لئے بڑا خوش حال ہے اور میرے پاس صرف ایک دنبی ہے جو میری معاش کا واحد سہارا ہے۔ اب بجائے اس کے کہ یہ اپنے غریب بھائی کو کچھ مدد کرے۔ مجھ سے کہتا ہے کہ اپنی ایک دنبی بھی مجھے دیدے۔ چونکہ امیر آدمی ہے اور صاحب اثر، اس لئے باتوں میں مجھے دبا لیتا ہے اور دوسرے لوگ بھی اس کی ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں اب آپ فیصلہ کیجئے کہ کیا اس کا یہ مطالبہ جائز ہے۔
>
> داؤد نے کہا کہ اس شخص کا یہ مطالبہ سراسر ظلم اور زیادتی پر مبنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگ جب بھی میل جول کر رہتے اور کاروبار میں باہمی شراکت کرتے ہیں تو ان میں سے اکثر کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ دوسروں پر زیادتی کرتے رہتے ہیں۔ (۳۸/۲۲-۲۴)

ربٰو

بڑا سرمایہ دار دوسروں کی محنت کی کمائی کو کس طرح غصب کر لیتا ہے، اسے قرآن کریم نے ربٰو سے تعبیر کیا ہے۔ ربٰو کے معنی صرف سود نہیں۔ اس سے مراد ہے سرمایہ کا معاوضہ لینا خواہ وہ کسی شکل میں ہو۔ قرآن کریم کی رُو سے، معاوضہ صرف محنت کا ہو سکتا ہے۔ سرمایہ کا نہیں۔ سود بھی اسی لئے حرام ہے کہ اس میں معاوضہ، سرمایہ کا لیا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے، اس حقیقت کی وضاحت کے لئے کہ جس نے کسی کو کچھ سرمایہ دیا ہے، اسے صرف سرمایہ واپس لینے کا حق ہے۔ اس سے زائد کچھ نہیں۔ بڑا جامع فقرہ ارشاد فرمایا ہے جب کہا ہے کہ اس طرح سے

لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ (۲/۲۷۹)

نہ تم کسی پر ظلم کرو گے، نہ کوئی تم پر ظلم کرے گا۔

لہٰذا محض سرمایہ کے بدلے میں دوسروں کی محنت سے کچھ لے لینا ظلم ہے۔ موجودہ نظام سرمایہ داری کی بنیاد ہی اس پر ہے۔

مترفین

جو لوگ خود محنت نہیں کرتے بلکہ اپنے سرمایہ کے زور پر، دوسروں کی محنت کی کمائی غصب کر لیتے، اور اس طرح تن آسانی کی زندگی بسر کرتے ہیں، قرآن کریم انہیں مترفین کہہ کر پکارتا ہے۔ قرآن کریم نے ایسی قوم کا انجام کیا بتایا ہے جس میں اس قسم کا معاشی نظام رائج ہو، یہ غور سے دیکھنے کی چیز ہے۔ سورۂ انبیاء میں ہے۔

ہم نے تم سے پہلے کتنی ایسی قوموں کو تباہ کر دیا جنہوں نے ظلم پر کمر باندھ رکھی تھی۔ وہ تباہ ہو گئیں اور ان کی جگہ دوسری قوموں نے لے لی۔ ان کی غلط روش کے نتائج غیر محسوس طور پر مرتب ہوتے جا رہے تھے اور ان سے کہا جا رہا تھا کہ تم اس روش کو چھوڑ دو، ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔ لیکن انہوں نے ایک نہ مانی چنانچہ وہ غیر محسوس نتائج آہستہ آہستہ آگے بڑھتے گئے۔ حتیٰ کہ وہ محسوس طور پر ان کے سامنے آ گئے، تو وہ انہیں دیکھ کر لگے بھاگنے۔

لیکن اس وقت وہ بھاگ کہاں سکتے تھے چنانچہ ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں للکارا اور کہا کہ اب تم بھاگ کر کہاں جا سکتے ہو۔ مت بھاگو اور اُلٹے پاؤں اپنی انہی عیش سامانیوں کی طرف چلو (مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ) جنہیں تم نے دوسروں کی کمائی سے حاصل کر رکھا تھا۔ اور ان محلات کی طرف پلٹو جن میں تم اپنے آپ کو اس قدر محفوظ سمجھا کرتے تھے۔ وہاں چلو تا کہ تم سے پوچھا جائے کہ یہ کچھ کس کی محنت سے بنا تھا اور تمہارا اس پر کیا حق تھا۔

اس وقت انہیں اس حقیقت کے اعتراف کئے بغیر چارہ ہی نہ تھا کہ وہ واقعی ظالم تھے اور اپنے کئے پر سخت متاسف۔

لیکن اس وقت اس ندامت اور تاسف سے کیا ہو سکتا تھا۔ جب نتائج مرتب ہو کر سامنے آ جائیں تو پھر وہ پلٹا نہیں کرتے۔ چنانچہ وہ برابر چلاتے رہے کہ جو زیادتیاں انہوں نے کی ہیں وہ ان پر بے حد متاسف ہیں۔ لیکن ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں ایسے کر دیا جیسے کٹا ہوا کھیت، یا بجھا ہوا شعلہ ( )

ان تباہ ہونے والوں کے متعلق دوسرے مقام پر کہا ہے کہ

ان کا یہ حال تھا کہ یہ ظالم اپنی اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے لگے رہتے اور دوسروں کا سب کچھ لوٹ کھسوٹ کر لے جاتے، تا کہ ان کی آسودگیوں اور تن آسانیوں میں فرق نہ آنے پائے، خواہ باقی انسانوں پر کچھ ہی کیوں نہ گزر رہے۔ یہ تھے ان کے وہ جرائم جن کی وجہ سے ان پر تباہی آئی تھی۔

یاد رکھو! خدا نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ کہ کسی بستی کو یونہی اندھا دھند ظلم و زیادتی سے تباہ کر دے، درآں حالیکہ وہاں کے رہنے والے، اپنے اور دوسروں کے حالات کو سنوارنے والے ہوں۔ ($\frac{11}{116-117}$)

باطل

اسی کو قرآنِ کریم نے "دوسروں کے مال کو باطل طریق سے کھا جانے" سے تعبیر کیا ہے ( ) اور کہا ہے کہ۔ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ( )

یاد رکھو! جو معاشرہ ظلم و سرکشی سے ایسی روش اختیار کرے گا، وہ بہت جلد تباہیوں کی آگ میں جھلس کر رہ جائے

گا۔ چونکہ اس قسم کا ظلم و جور اُنہی لوگوں کے ساتھ کیا جا سکتا ہے جو معاشرہ میں تنہا رہ جائیں۔ جن کا جتھہ یا پارٹی کوئی نہ ہو۔ اس لئے اسے خاص طور پر دہرایا گیا۔ کہ

> یاد رکھو! جو لوگ ظلم و زیادتی سے ایسے لوگوں کا مال کھا جاتے ہیں جو معاشرہ میں تنہا رہ جائیں۔ ان کے متعلق یوں سمجھو گویا وہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں۔ (۴/۱۰)

مذہبی پیشوائیت

یوں تو قرآن کریم میں ہر ناجائز طریقہ کو باطل کہا گیا ہے لیکن، حق کی ضد ہونے کی بناء پر اس سے مراد وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو بغیر کسی تعمیری کام کرنے کے مُفت میں بیٹھے دوسروں کی کمائی کھاتے رہیں۔ جیسے ایک تو وہ گروہ تھا جو اپنا سرمایہ لگا کر دوسروں کی محنت غصب کرتا تھا۔ لیکن یہ وہ گروہ ہے جو سرمایہ تک بھی نہیں لگاتا اور دوسروں کی کمائی پر تن آسانی کی زندگی بسر کرتا ہے یہ گروہ ہے مذہبی علماء اور روحانی پیشواؤں کا جن کی تصریح قرآن کریم نے ان الفاظ میں کر دی کہ

> يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ (۹/۳۴)

اے جماعتِ مومنین! (ان مذہبی عالموں اور روحانی پیشواؤں سے ہوشیار رہو) یہ (اِلّا ماشاء اللہ) وہ لوگ ہیں جو دوسروں کا مال باطل طریق پر کھا جاتے ہیں۔ عوام بچارے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف دعوت دینے والے لوگ ہیں۔ حالانکہ ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگ خدا کی راہ کی طرف آنے نہ پائیں کیونکہ اس سے انکی پیشوائیت ختم ہو جاتی ہے۔

اس کی وضاحت آگے چل کر یوں کر دی کہ

> ان کی حالت یہ ہے کہ اپنے خود ساختہ مسلک کو شریعتِ خداوندی کا نام دے کر لوگوں کو خدا کے سچے راستے کی طرف آنے سے روکتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ اس کے صاف اور سیدھے راستے میں خواہ مخواہ پیچ و خم پیدا کریں۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ خدا کے قانونِ مکافات اور حیاتِ آخرت پر ان کا ایمان ہی نہیں ہوتا انہوں نے مذہب کو محض بطور پیشہ اختیار کر رکھا ہوتا ہے۔ یہ وہ ظالم ہیں جن پر خدا کی لعنت برستی ہے۔ (۱۱/۱۹)

اس طرح یہ لوگ دین میں اختلافات پیدا کر کے، امت کو فرقوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ یہ وہ ظلم ہے جس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ سورہ زخرف میں (حضرت عیسیٰ کے ضمن میں) ہے۔

> فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِن بَيْنِهِمْ ۖ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ أَلِيمٍ ۔ (۴۳/۶۵)

ان میں مختلف گروہوں نے باہمی اختلاف پیدا کر لیا۔ سو جو لوگ اس طرح ظالم بن

جائیں ان کے لئے الم انگیز تباہی کا عذاب ہوتا ہے۔

عام جرائم

یہ ظلم کی موٹی موٹی شقیں ہیں ان کے علاوہ قرآن کریم نے عام قوانین کی خلاف ورزی کو بھی ارجے جرائم سے تعبیر کیا جاتا ہے) ظلم کہہ کر پکارا ہے۔ مثلاً ان لوگوں کو جو میدان جنگ میں دغا دیں، ظالمین کہا ہے۔ ([illegible]) چوری کے جرم کو بھی ظلم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ([illegible]) حتیٰ کہ ہر قسم کی لغزش کو بھی ([illegible]) ان لغزشوں میں، معاشرتی زندگی کی وہ برائیاں بھی شامل ہیں، جو غلط معاشرہ میں اس قدر عام ہو جاتی ہیں کہ انہیں پھر برائیاں سمجھا ہی نہیں جاتا۔ مثلاً سورۂ حجرات میں ہے۔

> اے جماعت مومنین! یاد رکھو۔ ایسا کبھی نہ ہو کہ تم میں سے ایک فریق، دوسرے فریق کا مذاق اڑانے لگ جائے اور اسے ذلیل اور حقیر کرنے کی کوشش کرے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ تم سے بہتر ہی ہوں۔ ——— نہ تمہارے مرد یہ کچھ کریں نہ عورتیں۔ نہ ہی تم ایک دوسرے کے خلاف عیب لگاؤ (بہتان تراشی کرو) نہ طعن وتشنیع کرو۔ نہ ایک دوسرے کے الٹے پلٹے نام رکھو۔ جب تم ایمان لا کر بلند اخلاق کے حامل بننے کا تہیہ کر چکے ہو تو پھر آپس میں ایک دوسرے کے برے نام رکھنے کا کیا مطلب؟ یہ بڑی بات ہے۔ اگر تم میں سے کسی نے ایسا کیا ہے تو اسے اپنے کئے پر نادم ہو کر فوراً اس روش کو چھوڑ دینا چاہیئے۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو اس کا شمار ظالمین میں ہو جائے گا۔ (۴۹/۱۱)

اس سے اگلی آیت میں یہ بھی ہے کہ ایک دوسرے کے متعلق ہمیشہ حسن ظن سے کام لو اور بدگمانی سے بچو۔ نہ ہی کسی کی رازکی باتوں کی ٹوہ میں لگے رہو، نہ ہی ایک دوسرے کی غیبت کرو۔ یہ سب برائیاں ایسی ہیں۔ جو ظلم کی شق میں آجاتی ہیں۔ حتیٰ کہ جو لوگ قوانین خداوندی کا مذاق اڑائیں اور انہیں (SERIOUSLY) نہ لیں، انہیں بھی ظالم قرار دیا گیا ہے اور ان سے کنارہ کش رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔ (۶/۶۸)

عدالتی نظام میں، مجرم کو اس کے جرم سے زیادہ سزا دینا بھی ظلم ہے۔ ([illegible])

ظلم اور ہم

یہ ہیں ظلم کی نوعیتیں جو قرآن کریم کے مختلف مقامات میں بیان ہوئی ہیں۔ آپ انہیں سامنے رکھئے اور پھر سوچیئے کہ ان میں سے کوئی شق بھی ایسی ہے جو ہمارے معاشرہ میں (نہ صرف یہ کہ پائی نہ جاتی ہو بلکہ) عام نہ ہو چکی ہو! اس حقیقت کو سامنے رکھیئے اور پھر قرآن کریم کے ان حتمی اور یقینی اعلانات کو سامنے لایئے جنہیں اس نے اپنے غیر متبدل قوانین کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ یعنی یہ کہ

ظالم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا ([illegible])

ظالم کی کھیتی کبھی پروان نہیں چڑھ سکتی۔ ([illegible])

ظالم قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ ([illegible])

وہ زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ جاتی ہے۔ ([illegible])

اس کی جڑ کٹ جاتی ہے اور انسانیت اس پر خدا کا شکر ادا کرتی ہے (۶/۴۵)

قرآن کریم نے یہ اصول اور قانون بیان کیا اور اس کی صداقت کی شہادت میں، وہ اقوام سابقہ کی سرگزشتوں کو سامنے لایا۔ اس نے، قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم مدین، قوم لوط، قوم فرعون، غرضیکہ تمام اقوام سابقہ کی تاریخ پیش کی ہے۔ اور واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ جب ان کے معاشرہ میں ظلم عام ہو گیا تو وہ تباہ ہو گئیں۔ وہ ان کے انفرادی تذکرہ کے بعد، بہ حیثیت مجموعی کہتا ہے کہ۔

یہ اقوام گزشتہ میں سے چند ایک کی سرگزشت ہے، جسے ہم تم سے بیان کر رہے ہیں۔ ان میں سے بعض آبادیاں تو ابھی تک موجود ہیں اور باقی اجڑ چکی ہیں۔
تم نے ان کے حالات سے دیکھ لیا ہوگا کہ ہم نے ان پر کسی قسم کی زیادتی نہیں کی انہوں نے خود ہی اپنے اوپر زیادتی کی تھی۔ سو جب ان کے اعمال کے نتائج کے ظہور کا وقت آگیا تو وہ جن غیر خداوندی قوتوں کے احکام کی اطاعت کیا کرتے تھے اور انہیں اپنا خدا سمجھے بیٹھے تھے، وہ ان کے کسی کام بھی نہ آ سکیں۔ ان کی اطاعت اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکی کہ وہ الٹا ان کی تباہی کا موجب بن جاتی۔
لہٰذا، تاریخ کے ان نوشتوں میں سے تم اس محکم اصول کو یاد رکھو، کہ جب بھی کسی قوم میں ظلم عام ہو جائے تو وہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی گرفت میں آجاتی ہے۔ اور یہ گرفت بڑی سخت اور الم انگیز ہوتی ہے۔
اقوام گذشتہ کی ان داستانوں اور قانونِ مکافات کے اس غیر متبدل اصول میں ہر اس قوم کے لئے واضح دلائل ہیں جو مستقبل کی تباہیوں کے احساس سے خائف رہتی ہے اور اس سے بچنا چاہتی ہے۔ (۱۱/۱۰۰-۱۰۳)

اس میں دوسروں کے لئے سامانِ عبرت اس لئے ہے کہ یہ محض اقوام سابقہ کے کوائف اور اخبار (CHRONICLES) نہیں جنہیں اساطیر الاولین (پرانے زمانے کے لوگوں کی کہانیاں) سمجھ کر پڑھ لیا جائے یہ، خدا کے اس قانون کی زندہ شہادات ہیں کہ جس قوم نے بھی ظلم کی روش اختیار کی اس کا انجام یہ ہوا۔ اس لئے جو قوم بھی اس قسم کی روش اختیار کرے گی۔ اس کا انجام اسی قسم کا ہوگا۔

فَإِنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذَنُوبًا مِّثْلَ ذَنُوبِ أَصْحَابِهِمْ (۵۱/۵۹)۔
ہر زمانے کے ظالمین کا انجام وہی ہوگا جو ان سے پہلے زمانے کے ظالمین کا ہوا تھا۔

فَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ (۲۳/۴۴) وہ قومیں ختم ہو جاتی ہیں اور ان کی صرف داستانیں باقی رہ جاتی ہیں۔
وَمَزَّقْنَاهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ۔ (۳۴/۱۹) ان کی اجتماعی حیثیت فنا ہو جاتی ہے اور ان کے افراد ادھر ادھر بکھرے ہوئے باقی رہ جاتے ہیں۔ جو اپنی مٹی ہوئی عظمت کی عبرت ناک یادگار ہوتے ہیں اور اپنے ماضی کی لاشوں کو اپنے کندھوں پر اٹھائے۔ در بدر مارے مارے پھرتے رہتے ہیں اقوام سابقہ کی ان داستانوں کے بیان کرنے سے قرآن کا مقصد یہی ہے۔ وہ ہر داستان کے بعد ہم سے کہتا ہے کہ۔

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ([illegible])

دیکھو! ظالمین کا انجام کیا ہوا؟

وہ کہتا ہے کہ تم یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب نہ دے لینا کہ وہ قومیں کمزور تھیں۔ انہوں نے اپنے وسائل پیداوار کو ترقی دے کر، ان سے کما حقہٗ فائدہ نہیں اٹھایا تھا، اس لئے وہ تباہ ہو گئیں۔ یہ خیال غلط ہے۔

وہ قومیں شان و شوکت میں تمہاری قوم مخاطب سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں۔ انہوں نے زمین کے سینے کو چیر کر اس میں چھپے ہوئے خزانوں کو باہر نکالا۔ ملکوں کو آباد کیا —— ان کی آبادیاں، ان کی آبادیوں سے کہیں زیادہ تھیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ تباہ ہو گئیں۔ اس لئے نہیں کہ خدا نے انہیں یونہی ظلم و تعدی سے تباہ کر دیا۔ خدا کبھی ایسا نہیں کرتا۔ وہ تباہ اس لئے ہوئیں کہ انہوں نے اپنے آپ پر ظلم کر رکھا تھا۔ ([illegible])

دوسری جگہ ہے۔ ہم نے کتنی ہی ایسی قومیں تباہ کر دیں جن کی معاشی حالت نہایت اعلیٰ تھی۔ انہیں سامانِ زینت کی فراوانیاں حاصل تھیں۔ یہ ہیں ان کی ویران شدہ بستیاں جن میں ان کے بعد کوئی بھی آباد نہ ہوا، اور ان کے وارث ہم ہی قرار پاتے ...... یہ اس لئے کہ وہ قومیں ظالم تھیں اور ہم ظالم قوموں ہی کو تباہ کیا کرتے ہیں ([illegible])

اپنے آپ پر ظلم

ہم نے اوپر (آیت [illegible] میں) دیکھا ہے کہ قرآن یہ کہتا ہے کہ ان تباہ ہونے والی قوموں پر خدا نے ظلم و زیادتی نہیں کی تھی۔ "انہوں نے خود اپنے آپ پر زیادتی کی تھی" (وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ) قرآن کریم نے یہ اصطلاح ظلم کے سلسلہ میں اکثر و بیشتر استعمال کی ہے اور یہ ایک عظیم حقیقت ہے جسے قرآن سادہ سے انداز میں پیش کرتا ہے۔ ظالم سمجھتا یہ ہے کہ وہ دوسرے کو نقصان پہنچا رہا ہے لیکن اگر وہ ذرا بہ نظرِ تعمق دیکھے تو اسے نظر آ جائے کہ وہ کسی دوسرے کو نقصان نہیں پہنچا رہا بلکہ خود اپنی ذات کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ وہ بزعم خویش دوسروں کو تباہ کرتا ہے لیکن درحقیقت اپنے آپ کو تباہ کر رہا ہوتا ہے۔ بالادست جماعت یا قوم، کمزور جماعتوں یا قوموں کو کچلتی ہے اور اس میں بڑی لذّت محسوس کرتی ہے لیکن اس ظلم و تعدی سے وہ درحقیقت خود اپنی جڑیں کھوکھلی کر رہی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن ہر تباہ ہونے والی قوم کی داستانِ عبرت و موعظت بیان کرنے کے بعد، واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ([illegible])

ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا، انہوں نے خود اپنے آپ پر ظلم و زیادتی کی تھی، جس کی وجہ سے وہ تباہ ہو گئے۔

تباہی کہاں سے آتی ہے؟

یہ قومیں عقل و شعور کی مالک ہوتی ہیں۔ اس لئے اپنی طرف سے پورا پورا انتظام کر لیتی ہیں کہ ان پر کہیں سے تباہی نہ آنے پائے۔ وہ سیاسی تدبّر کی فسوں سازیوں سے، وہ تمام راستے بند کر لیتی ہیں جن سے وہ سمجھتی ہیں کہ ان کی تباہی کے اسباب اندر داخل ہو سکتے ہیں۔ وہ ہر ممکن خطرہ کی روک تھام کے لئے احتیاطی تدابیر اختیار کر لیتی ہیں۔ وہ ہر سر اٹھانے والے کا سر قبل اس کے کہ وہ سر اٹھے، کچل کر رکھ دیتی ہیں۔ وہ اپنی طرف سے اپنی حفاظت کا سارا اہتمام کر لیتی ہیں۔ وہ اپنی سیاست کے محکم قلعوں میں بزعم خویش، مصئون و مامون ہو کر بیٹھ جاتی ہیں۔ لیکن نہیں سمجھتیں کہ ان قلعوں

کی بنیادیں خرابی کی ایک صورت مضمر ہے جو اسے اندر ہی اندر کھوکھلا کئے جارہی ہے۔ چنانچہ، ان کی ان تمام تدابیر کے علی الرغم، ان پر تباہی کا عذاب ان راستوں سے آجاتا ہے جو ان کی عقل و شعور تک میں نہیں ہوتے۔ قرآن کے الفاظ ہیں:۔

> جو کچھ یہ کر رہے ہیں، کوئی نئی بات نہیں۔ ان سے پہلی قوموں نے بھی اسی قسم کی ڈپلومیٹک تدابیر اختیار کر رکھی تھیں کہ کوئی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے نہ پائے۔ لیکن خدا کے قانونِ مکافات نے ان کے نظامِ تمدن کی بنیادوں تک کو ہلا دیا، اور اس کی چھتیں ان کے اوپر آکر گریں۔ انہوں نے اپنی طرف سے تباہی کے ہر راستے بند کر رکھے تھے۔ لیکن تباہی ان پر ان راستوں سے آ پہنچی جو ان کی عقل و شعور تک میں نہ تھے۔ (14/46)

تباہی کی شکلیں

یہ تباہی کن شکلوں میں آتی ہے، اس کے متعلق کہا کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سوسائٹی کے اوپر کے طبقہ میں خرابیاں عام ہو جاتی ہیں اور ان کی وجہ سے معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔ کبھی نیچے کے طبقہ میں لاقانونیت پھیل جاتی ہے تو وہ تباہی مچا دیتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ یہ دونوں طبقے متضاد پارٹیاں بنا لیتے ہیں اور ایک دوسرے سے لڑ کر تباہ ہو جاتے ہیں (6/65)

لیکن ظالم قوم کی تباہی کی مؤثر ترین صورت وہ ہے جس میں مظلوم طبقہ قوانینِ خداوندی کے مطابق، اپنے اندر نظم و ضبط پیدا کر کے، ایک ایسا نظام قائم کر لیتا ہے جس میں ہر ظالم کو نظر آ جاتا ہے کہ اس کا صحیح مقام کونسا ہے قرآن کریم نے (سورۂ شعراء میں) "زندگی سے شاعری کرنے والی" جماعتوں کے مقابلہ میں، قوم مومنین کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے۔

> ان کے برعکس، وحی پر ایمان لانے والے ہیں جو ایک متعین نصب العین پر یقین رکھتے ہیں اور ایسے پروگرام پر عمل پیرا رہتے ہیں جو ان کی اپنی ذات کی صلاحیتوں کی بھی نشو و نما کرے، اور دنیا کے بگڑے ہوئے کام بھی سنوار دے۔ وہ زندگی کے ہر گوشے میں قوانینِ خداوندی کو سامنے رکھتے ہیں۔ اُسے کبھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ جب ان پر کوئی ظلم و زیادتی کرتا ہے تو وہ شاعروں کی طرح اس کی ہجو لکھ کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا نہیں کر لیتے بلکہ اس سے اس ظلم و زیادتی کا بدلہ لیتے ہیں اور ایک ایسا نظام قائم کرتے ہیں جس میں ظلم و زیادتی کرنے والے بدلگام نہ پھرتے رہیں بلکہ انہیں نظر آ جائے کہ ان کا صحیح مقام کونسا ہے جس کی طرف انہیں لوٹا کر لایا جائیگا۔ اسے انقلاب کہا جاتا ہے۔ (26/227)

قوموں کی تباہی سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ ان کا کوئی فرد باقی نہیں رہتا۔ اس سے مفہوم یہ ہوتا ہے کہ ان کی شان و شوکت، قوت و ثروت، عزت و عظمت، حکومت و سطوت چھن جاتی ہے اور وہ دنیا میں ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتی ہیں۔

فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ... (۳۹/۲۶)

ان کے ظلم کا نتیجہ یہ تھا کہ انہیں اسی دنیا میں ذلت و خواری کی زندگی بسر کرنی پڑی

(اور مستقبل کا عذاب اس سے کہیں زیادہ ہوگا)

دوسرے مقام پر کہا ہے کہ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ (۱۶/۱۱۲) ان پر بھوک اور خوف کا عذاب طاری ہو گیا۔ یعنی وہ اپنی روٹی تک کے لئے دوسری قوموں کے محتاج ہو گئے۔ اور انہیں اپنی ہستی کی حفاظت کے لئے ہر وقت دھڑکا لگا رہا۔ یہ ہیں قوموں کی تباہی کی علامات۔ سورۂ طٰہٰ میں قرآن کریم نے اسے ایک ایسے لفظ سے تعبیر کیا ہے جس کے اجمال میں ہزار تفاصیل پوشیدہ ہیں۔ کہا۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا۔ (۲۰/۱۱۱) اَلْخَيَابُ اس چقماق کو کہتے ہیں جس سے آگ کی چنگاری نہ نکلے۔ یعنی ظلم کرنے والی قوموں کی کیفیت اس چقماق کی سی ہو جاتی ہے جن کی شکل و صورت تو ویسے کی ویسی ہی رہے لیکن اس میں زندگی بخش حرارت باقی نہ رہے وہ شعلۂ افسردہ کی طرح ہو جاتے۔ یہ ہے ہلاک شدہ قوموں کا عبرت انگیز مرقع۔

مہلت کا وقفہ

آپ نے اکثر لوگوں کو یہ کہتے سنا ہوگا کہ آپ یہ کہتے ہیں کہ ظالم پنپ نہیں سکتا لیکن ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ ظالم دن رات پنپتے چلے جاتے ہیں۔ ان کا ہر پروگرام کامیاب ہوتا ہے۔ وہ کھلے بندوں دندناتے پھرتے ہیں اور کوئی ان کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ افراد کا بھی یہی حال ہے اور اقوام کی بھی یہی کیفیت، جو قوم قوت فراہم کر لے، وہ دوسری قوموں کے خلاف جو جی میں آئے کرے، اسے کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ مظلوم اور کمزور پستے چلے جاتے ہیں۔ اور ظالم اور قاہر ہر ہرے بھرے پھرتے ہیں

قرآن کہتا ہے کہ یہ تمہاری نگاہ کی محدودیت ہے جو صرف چند قدموں تک دیکھ سکتی ہے، اس سے آگے نہیں جا سکتی۔ اگر تمہاری حد نگاہ وسیع ہوتی تو تم دیکھ لیتے کہ ظالم، انجام کار، تباہ و برباد ہو جاتا ہے بات یہ ہے کہ خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے، عمل اور اس کے نتیجے کے محسوس شکل میں سامنے آنے میں ایک مدت ہوتی ہے، جسے مہلت کا وقفہ کہا جاتا ہے۔ ہر عمل کا نتیجہ تو اس کے ساتھ ہی مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ محسوس شکل میں ایک مدت کے بعد جا کر سامنے آتا ہے۔ تمہاری نگاہ اس "مہلت کے وقفہ" میں الجھ کر رہ جاتی ہے اور تم خیال کر لیتے ہو کہ ظلم نتیجہ خیز ہی نہیں رہا۔ بس یہ ہے تمہاری بھول۔ سورۂ ابراہیم میں ہے۔

> تم اس کا وہم و گمان تک بھی نہ کرو کہ یہ ظالم اور سرکش لوگ جو کچھ کر رہے ہیں ہم اس سے بے خبر ہیں۔ ہمارا قانونِ مکافات سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ لیکن یہ وقفہ مہلت کا ہے۔ جب ظہورِ نتائج کا وقت آ جائے گا، اس وقت تباہیوں کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ کر ان کی حالت یہ ہو جائے گی کہ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔ افراتفری کا یہ عالم ہوگا کہ یہ ادھر ادھر دیکھے بغیر، منہ اٹھائے، بدحواس بھاگے چلے جائیں گے۔ سب ان کا ساتھ چھوڑ جائیں گے۔ حتٰی کہ ان کی نگاہ بھی کاشانۂ چشم میں لوٹ کر نہیں آئے گی۔ ان کے دل امیدوں سے خالی ہو جائیں گے۔ یاس انگیز تاریکیاں ان پر بری طرح چھا جائیں گی۔ (۱۴/۴۲-۴۳)

دوسرے مقام پر اس قانونِ تدریج و امہال کی حکمت بھی بیان کر دی ہے، جہاں کہا ہے کہ

> اگر کائنات کے ارتقاء میں تدریجی قانون کارفرما نہ ہوتا، اور خدا کا قانونِ مکافات لوگوں کے ظلم و زیادتی پر اُن کی فوری گرفت کر لیا کرتا، تو صفحۂ ارض پر کوئی چلنے والا (انسان) نظر نہ آتا۔ لیکن وہ ایسا نہیں کرتا، بلکہ انہیں مقررہ تاریخی منازل تک پہنچانے کے لئے ان کے انجام کو مؤخر کرتا جاتا ہے اور جب وہ اپنے مستقر تک پہنچ جاتے ہیں تو اس کے بعد نہ ایک ثانیہ کی دیر ہوتی ہے، نہ سویرا۔ ان کے اعمال کا آخری فیصلہ کن نتیجہ سامنے آجاتا ہے۔ ([illegible])

اسی کو قرآن نے "پلڑا جھکنے" (ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ) سے تعبیر کیا ہے۔ قوموں کو سرفرازی اس وقت نصیب ہوتی ہے جب ان کے تعمیری کاموں کا پلڑا جھکا ہوتا ہے۔ اس کے بعد، ان کی تخریبی کارفرمائیاں شروع ہو جاتی ہیں تو تعمیری پلڑا آہستہ آہستہ اوپر کو اٹھنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس دوران میں اگر وہ اپنی اصلاح کر لیں اور تعمیری کاموں کے وزن میں اضافہ کر لیں تو وہ تباہی سے بچ جاتی ہیں (رسالت کے وقفہ سے دراصل مقصد یہی ہوتا ہے کہ ہلاکت سے پہلے، بازآفرینی کا موقعہ بہم پہنچایا جائے)۔ لیکن اگر وہ اپنی روش سے باز نہیں آتیں، تو تخریبی پلڑا بھاری ہوتا چلا جاتا ہے اور جب وہ تعمیری پلڑے کے مقابلہ میں، زیادہ جھک جاتا ہے، تو قوم پر تباہی آ جاتی ہے۔ اس وقت بازیابی کا موقعہ باقی نہیں رہتا۔ تباہی کے اس طرح محسوس شکل میں سامنے آنے سے، انہیں خدا کے قانونِ مکافات کی صداقت کا یقین آ جاتا ہے لیکن اس وقت یہ احساس و یقین انہیں کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ دیکھئے سورۂ مومن میں اس حقیقت کو کس قدر واشگاف انداز سے بیان کیا گیا ہے۔

> اگر یہ لوگ اس امر کا مشاہدہ کرنا چاہتے ہیں کہ ظلم و تعدی سے قومیں کس طرح تباہ ہوا کرتی ہیں، تو ان سے کہو کہ ذرا دنیا میں چلو پھرو اور دیکھو کہ جو قومیں تم سے پہلے ہو گزری ہیں، ان کا انجام کیا ہوا۔ وہ تعداد میں بھی ان سے زیادہ تھے اور قوت میں بھی ان سے بڑھ چڑھ کر، انہوں نے زمین سے پیدا ہونے والے سامانِ زیست پر بھی ان سے کہیں زیادہ تصرف حاصل کر رکھا تھا۔ لیکن ان کا مال و دولت اور ان کی ہنرمندی و کاریگری، انہیں ان کے غلط اعمال کے تباہ کن نتائج سے بالکل نہ بچا سکے۔ وہ سب دھرے کا دھرا رہ گیا۔
>
> جب ان کے رسول ان کے پاس واضح دلائل لے کر آئے تو انہوں نے ان کی تکذیب کی، اور اپنے علم و ہنر پر نازاں رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس تباہی کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے، اس نے انہیں آ دبوچا۔
>
> جب انہوں نے اس تباہی کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا تو چلا اٹھے اور کہنے لگے کہ ہم خدائے واحد پر ایمان لاتے ہیں اور جن قوتوں کو ہم اس کے شریک سمجھتے تھے، ان سے انکار کرتے ہیں۔

لیکن اس ایمان نے انہیں کچھ فائدہ نہ دیا جسے وہ عذاب کو دیکھ کر لائے تھے۔ ایمان وہی نفع بخش ثابت ہو سکتا ہے جو ظہورِ نتائج سے پہلے لایا جائے کیونکہ اس صورت میں ہنوز وقت ہوتا ہے کہ انسان، تعمیری کاموں سے، سابقہ تخریبی اعمال کے مضر اثرات کا ازالہ کر سکے۔ (۴۰/۸۴-۸۵)

اور اس کے بعد ہے؛

سُنَّتَ اللّٰہِ الَّتِیْ قَدْ خَلَتْ فِیْ عِبَادِہٖ ۚ (۴۰/۸۵)

یہ خدا کا وہ قانون ہے جو انسانوں پر شروع سے نافذ ہوتا چلا آ رہا ہے۔

اُس وقت نہ تو ان کا ایمان کچھ کام دے سکے گا اور نہ ہی ان کا چیخنا چلانا کچھ کفایت کر سکے گا۔ یہ مدد کے لئے چیخیں چلائیں گے اور کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! تو ہمیں ایک بار یہاں سے نکال دے، پھر دیکھ کہ ہم کس طرح اپنی سابقہ روش کے خلاف، تیرے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اچھے کام کرتے ہیں۔ ان سے کہا جائے گا کہ کیا تمہیں اتنی عمر نہیں دی گئی تھی کہ تم میں سے جو ہمارے قانون کے مطابق نصیحت حاصل کرنا چاہتا وہ اس کے لئے کافی ہو جاتی؟ اور پھر تمہارے پاس وہ پیغامبر بھی آ گیا تھا جو تم سے پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ تمہاری روش تمہیں تباہی کے جہنم کی طرف لے جائے گی۔ لیکن تم نے اس کی ایک نہ مانی۔ سو اب تم اپنے اعمال کے نتائج بھگتو۔ اب کوئی تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ ظلم کرنے والوں کا کوئی مددگار نہیں ہو سکتا۔ (۳۵/۳۷)

کارگہِ کائنات کیوں سرگرمِ عمل ہے؟

ہمارے سامنے لوگوں کے غلط اعمال کی سزا کے لئے دنیا کا عدالتی نظام ہی ہوتا ہے جو ناقص بھی ہو سکتا ہے اور خائن (بددیانت) بھی۔ یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ ظلم کرنے والے دندناتے پھرتے اور دن بدن پھولتے پھلتے چلے جاتے ہیں، اور انہیں کوئی روکنے ٹوکنے والا ہی نہیں، تو یہ دنیاوی نظامِ عدل کا نقص نہیں ہوتا۔ اس کا ایک اپنا نظام ہے جو نہ ناقص ہو سکتا ہے نہ خائن۔ اس کی نتیجہ خیزی اٹل ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ تمام سلسلۂ کائنات اسی نظامِ عدل کو قائم رکھنے کے لئے سرگرمِ عمل ہے۔

وَخَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۴۵/۲۲)

تاکہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ ملتا رہے اور کسی پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی نہ ہو (نیز ۴۶/۱۹، ۳۴/۳۰، ۲۱/۴۷)

کسی پر کسی قسم کا ظلم و زیادتی نہ ہو ——— یہ ہے مقصدِ تخلیقِ کائنات ——— اسی کا نام خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل ہے، جسے عوام کی زبان میں "خدا کی چکی" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

یہ چکی پستی تو بے شک بہت باریک ہے لیکن اس کی رفتار ہمارے حساب و شمار کے مطابق بہت سست ہوتی ہے اور مظلوم کی یہ انتہائی آرزو ہوتی ہے کہ وہ ظالم کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔

یہ تجھ سے کہتے ہیں کہ وہ تباہی جلد آنی چاہیئے — وہ تباہی ضرور آئے گی۔
خدا کا قانون اٹل ہے لیکن اس کی رفتار بڑی سست ہے۔ خدا کا ایک دن،
تمہارے حساب و شمار سے ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے (۲۲/۴۷)

اب اس کا کیا کیا جائے؟ مظلوم کے دل کی پکار رہ رہ کر کہتی ہے کہ؎

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

یہ ہے "بیتابیٔ تمنا اور صبر طلبیٔ عشق"[1] کی وہ کشمکش، جس کے حل کے لئے قرآن چاہتا ہے کہ دنیا میں خود انسانوں کے ہاتھوں ایک ایسا نظام قائم ہو جو لوگوں کے اعمال کی نتیجہ براری میں تو، نظامِ کائنات کے مماثل ہو، لیکن اس کی رفتار اتنی سست نہ ہو۔ اس کا نام دین کا نظام، یا اسلامی مملکت ہے جس کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ — لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔ ہر متنفس کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ مل جائے، اور کسی پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی نہ ہو، اس نظام کو سب سے پہلے حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے متشکل کرکے دنیا کو دکھا دیا کہ خدا کا وہی دن، جو نظامِ کائنات میں ایک ایک ہزار سال کا ہوتا ہے، اس نظام میں کس طرح چوبیس گھنٹے کا بن جاتا ہے یہ وہ نظام ہے جو دنیا کے کسی جابر اور ظالم سے کسی قسم کی مفاہمت نہیں کر سکتا۔ اس نظام کے داعیٔ کو آگاہ کر دیا گیا کہ یاد رکھو۔

یہ لوگ چاہیں گے کہ اگر تم تھوڑا سا ان کی طرف جھک جاؤ تو یہ تمہاری طرف جھک جائیں۔ دیکھنا، ایسا نہ کرنا۔ (۶۸/۹)

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ۔ (۱۱/۱۱۳) — اگر تم ذرا بھی ان کی طرف جھک گئے اور اس طرح ان سے مفاہمت کر لی، تو یاد رکھو تم بھی اسی جہنم کے عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ جس میں یہ لوگ ماخوذ ہیں — تمہارا نظام، عدل پر مبنی ہے اور عدل اگر ذرا سا بھی ظلم کی طرف مائل ہو جائے تو وہ عدل نہیں رہتا، ظلم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب انہوں نے مفاہمت کی کوشش کی، تو اس نظام کے داعیٔ برحق نے ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ میں قوانینِ خداوندی میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ میں تو خود انہی کا اتباع کرتا ہوں۔

اِنِّىْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّىْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۱۰/۱۵)
اگر میں بھی قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو مجھے اس کے نتیجے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ میں بھی اسی عذاب کی لپیٹ میں آ جاؤں گا۔

یہ تھا وہ نظام جس کے متعلق اعلان کر دیا کہ یاد رکھو۔
اس میں کوئی شخص کسی کے جرم کا ذرا سا بھی بوجھ نہیں بٹا سکے گا۔ ہر ایک کو اپنے کئے کی سزا خود بھگتنی پڑے گی۔ نہ ہی کسی کی شفاعت کسی کے کام آئے گی، نہ ہی کسی سے

[1] عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب ؎ دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک (غالب)

اس کے جرم کے معاوضہ میں کچھ رشوت لے کر اُسے چھوڑ دیا جائے گا، نہ ہی کوئی شخص
کسی مجرم کا حمایتی بن سکے گا۔ (۲/۴۸)

دنیا کے نظامِ عدل کی رُو سے، اگر کسی مقدمہ کا فیصلہ مروجہ قانون کے ٹھیک ٹھیک مطابق ہو جائے، تو عدل کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے لیکن قرآنِ کریم اس سے بھی ایک قدم آگے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ قانون کے مطابق فیصلہ عدل کہلائے گا۔ لیکن اگر خود وہ قانون ہی ظلم اور ناانصافی پر مبنی ہو تو اس کے مطابق فیصلہ کس طرح مبنی بر عدل قرار پا سکتا ہے؟ لہٰذا، وہ اس نظام کے متعلق جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے کہتا ہے کہ اس میں قانون سازی کا اختیار انسانوں کو حاصل ہی نہیں ہوتا۔ اصولی طور پر قوانین، خدا کے نازل کردہ ہوتے ہیں اور وہ نظام ان کے مطابق فیصلے کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ ۔ (۷/۱۵۹)

یہ لوگ دوسروں کو حق کی راہ بتاتے ہیں اور اسی کے مطابق عدل کرتے ہیں۔

یہی وہ حقیقت ہے، جسے شروع میں بیان کیا جا چکا ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے وہ لوگ ظالم ہیں جو۔ " مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ " کے مطابق فیصلے نہیں کرتے۔ (۵/۴۵)

بازگشت نگہہ

ظلم کی مختلف نوعیتیں، جنہیں قرآنِ کریم نے اس شرح و بسط سے بیان کیا ہے، ہمارے سامنے آگئیں۔ آپ انہیں دیکھئے اور سوچئے کہ ان میں سے کوئی شق بھی ایسی ہے۔ جو آج باقی دنیا کو تو چھوڑیئے خود ہمارے معاشرے میں نہ پائی جاتی ہو؟ آپ دیکھیں گے کہ ظلم کی ان شقوں کا ہمارے ہاں پایا جانا تو ایک طرف، یہ ہمارے معاشرہ کا معمول بن چکی ہیں اور اس قدر عام ہو چکی ہیں کہ ان سے اب ہمارے دل میں کھٹک تک پیدا نہیں ہوتی ــــ اگر کھٹک پیدا ہوتی ہے تو صرف اس وقت جب کوئی دوسرا ہم پر زیادتی کرے۔

اس کے بعد، آپ پھر وہیں چلے چلئے جہاں سے بات شروع کی گئی تھی یعنے ایک ذہنیت یہ ہے کہ یہ کہنا کہ ظالم پنپ نہیں سکتا۔ ظلم کا انجام تباہی ہوتا ہے، کمزوروں اور ناتوانوں کی خود فریبی ہے جو فرد یا قوم، قوت حاصل کر کے اپنی مدافعت کا سامان مہیا کر لیتی ہے، اسے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ دنیا کا یہی چلن رہا ہے، یہی چلن رہے گا۔ ظاہر ہے کہ ایسے معاشرہ میں سارا زور اپنی قوت اور مدافعت کا سامان مہیا کرنے پر دیا جائے گا۔ ظلم و جور سے رُکنے کا خیال کبھی پیدا نہیں ہوگا۔

دوسری ذہنیت یہ ہے کہ خدا کا یہ اٹل قانون ہے کہ ظالم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا اور جس معاشرہ میں ظلم کا چلن عام ہو، وہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ خواہ اس نے اپنی حفاظت اور مدافعت کے کتنے ہی انتظامات کیوں نہ کر رکھے ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسے معاشرہ میں، ساری کوشش ظلم سے رُکنے کی کی جائے گی۔

اول الذکر ذہنیت کا نام تنذا سے انکار (کفر) ہے اور دوسری کو خدا پر ایمان (اسلام) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اب آپ خود ہی فیصلہ کر لیجئے کہ ہمارا شمار کس زمرے میں ہو سکتا ہے؟ اس کے ساتھ ہی اسے بھی اچھی

طرح سمجھ لیجئے، کہ قانونِ خداوندی کے اٹل ہونے کے یہ معنی نہیں کہ اگر آپ اس پر ایمان رکھتے ہیں تو وہ اپنا نتیجہ پیدا کرے گا۔ اور اگر آپ اسے صحیح تسلیم نہیں کرتے تو وہ معطل ہو جائے گا۔ قطعاً نہیں۔ وہ قانون بہر حال اور بہر حیثیت اپنا نتیجہ پیدا کر کے رہے گا۔ خواہ آپ اسے صحیح مانیں یا نہ مانیں۔ سنکھیا بہرحال مہلک ہے، خواہ آپ اس کی ہلاکت آفرینی کو حق تسلیم کریں یا جھوٹ سمجھیں ——— اور سنکھیا اس شخص کو بھی اسی طرح ہلاک کر دیگا۔ جو زبان سے اس کی ہلاکت آفرینی کا اقرار کرے لیکن پھر بھی اُسے پھانک لے، جس طرح اس شخص کو ہلاک کر دے گا۔ جو اس کی ہلاکت آفرینی کا کھلے بندوں انکار کرتا ہوا اُسے چاٹ لے لہٰذا اگر خدا کا یہ قانون اٹل ہے ——— اور اس کے اٹل ہونے میں شبہ ہی کیا ہے ——— (کہ جس قوم میں ظلم عام ہو جائے وہ تباہ ہو جاتی ہے۔) اور ہماری روش یہی رہی، تو "پاکستان زندہ باد" کے ہزار نعروں، اور "ملتِ اسلامیہ، پائندہ باد" کی لاکھ تمناؤں کے باوجود، ہم تباہی سے بچ نہیں سکتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بیرونی خطرات سے ملک کی حفاظت کا انتظام نہایت ضروری ہے، اور ایسا انتظام ضرور کرنا چاہیئے اور ملک کے ہر باشندے کو اس میں پورا پورا حصہ لینا چاہیئے (کہ اپنی سرحدوں کو مضبوط و مستحکم رکھنے کا حکم بھی خداوندی ہے) اس میں بھی کلام نہیں کہ ملک کی خوشحالی اور فارغ البالی کے لئے مادی ترقی بھی نہایت ضروری ہے (کہ بھوک کو خداوندکریم نے خدا کا عذاب قرار دیا ہے) لیکن، ان تمام انتظامات و اہتمامات کے باوجود ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر ہم نے اپنے معاشرہ میں ظلم کی بڑھتی ہوئی رَو کو نہ روکا، تو یہ انتظامات و اہتمامات ہمیں تباہی سے کبھی نہیں بچا سکیں گے، نہ ہی ہماری مروّجہ نمازیں اور ہمارے روزے، ہمارا حج اور ہماری زکوٰۃ، ہماری نذریں اور ہماری نیازیں، ہمارے وعظ اور ہمارے خطبے ہمیں اس تباہی سے محفوظ رکھ سکیں گے۔ کہ خدا نے یہ کہیں نہیں کہا کہ ظالم قوم کی رسمی مذہب پرستی اسے ظلم کی آورد تباہی سے بچالے گی۔

جب ہم ظلم کا لفظ زبان پر لاتے ہیں تو ہماری نگاہیں ہمیشہ اعمالِ حکومت اور اربابِ نظم و نسق کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔ اور ہم یہ کہہ کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیتے ہیں کہ ظلم ان کی طرف سے ہوتا ہے ہم اس کے مجرم نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ظلم عام طور پر اپنی شدید اور محسوس شکل میں غلط نظامِ حکومت اور اربابِ اقتدار کی غلط کوششوں اور غلط کاریوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے ظلم کی جن نوعیتوں کا ذکر کیا ہے، انہیں ایک مرتبہ پھر سامنے لایئے اور دیکھئے کہ ان میں سے کتنی شقیں ایسی ہیں جن کے مرتکب ہم خود ہوتے ہیں۔ لہٰذا جس معاشرہ میں قرآنی تصوّر کے مطابق ظلم کا دور دورہ ہو۔ اس میں ظلم کسی خاص طبقہ تک محدود نہیں ہوتا۔ اس کے جراثیم سارے جسدِ معاشرہ میں حلول کئے ہوتے ہیں۔

لیکن اگر یہ تصوّر بھی کر لیا جائے کہ ظلم کسی خاص طبقے کی طرف سے ہوتا ہے، ہم اس کے مرتکب نہیں ہیں۔ تو اس کے یہ معنے نہیں کہ ظلم کی وجہ سے جب معاشرہ پر تباہی آئے گی تو وہ چُن چُن کر ان افراد کو گھیر لے گی۔ جو ظلم کے مرتکب ہوتے تھے اور ہمیں چھوڑتی جائے گی۔ قطعاً نہیں۔ جب قوموں پر تباہی آتی ہے تو پھر ——— ذکر را منزلت باشد نہ مہ را ——— اس سے ساری کی ساری قوم تباہ ہوا کرتی ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ

وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً (۸/۲۵)

اس تباہی سے اپنے آپ کو بچانے کی (قبل از وقت) تدبیر کر لو کہ جب وہ آتی
ہے تو پھر انہی لوگوں تک محدود نہیں رہا کرتی جنہوں نے ظلم کیا تھا۔

جب کسی ناعاقبت اندیش کے کشتی میں چھید کر دینے سے کشتی میں پانی بھر جاتا ہے تو اس سے صرف وہی شخص نہیں ڈوبا کرتا جس نے کشتی میں چھید کیا تھا --- کشتی کے تمام مسافر ڈوب جایا کرتے ہیں۔

وہ ہے خدا کا قانون، اور یہ ہے (باقی دنیا کے ساتھ) ہمارے معاشرہ کی موجودہ حالت۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہم ابھی اس مہلت کے وقفہ سے گزر رہے ہیں جو تباہی سے پہلے آتا ہے[۱]۔ اگر ہم اب بھی سنبھل جائیں تو ہمارے بچاؤ کی صورت ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر ہم نے اس وقفہ سے فائدہ نہ اٹھایا اور اسی رفتار سے آگے بڑھتے گئے، تو پھر خدا کا اٹل قانون اپنا نتیجہ مرتب کر کے رہے گا اور ہمارا حشر بھی انہیں قوموں جیسا ہو جائے گا۔ جن کے متعلق کہا ہے کہ:-

وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ --- وہ قوم تباہ ہو گئی اور ہم نے کسی دوسری قوم کو اسکا وارث بنا دیا۔

فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ --- پھر ان کی تباہی پر نہ آسمان نے آنسو بہائے نہ زمین کی آنکھ نم آلود ہوئی

وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ (۴۴/۲۸-۲۹) --- اور نہ ہی انہیں اس کی مہلت دی گئی، کہ اپنے بچاؤ کا سامان کر سکیں۔

لہٰذا

"حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں"

۱؎ یہ مقالہ ۱۹۶۸ء میں لکھا گیا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کے المیے کی شکل میں ہماری تباہی کی قسطِ اوّل ہم پر مسلط ہو گئی اب مغربی پاکستان کے سلسلہ میں ہم مہلت کے وقفہ سے گزر رہے ہیں۔ (طلوعِ اسلام)

مساواتِ محمدی

آپ جانتے ہیں کہ پاکستان --- کی فضا میں نعرہ بازی کے جھگڑے نے، قوم کے سوچنے سمجھنے کے چراغ گل کر دیئے ہیں۔ اس قومی سطح کی تباہی سے بچنے کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ ہم ان نعروں کی حقیقت کا کھوج لگائیں --- مفکرِ قرآن پرویز صاحب نے وطنِ عزیز میں عام کردہ نعرہ "مساواتِ محمدی" کی حقیقت پر پڑے ہوئے پردوں کو نہایت محققانہ انداز سے اٹھایا ہے --- ان کا یہ خطاب ماہنامہ طلوعِ اسلام بابت ماہ جون ۷۲ء کی اشاعت میں شائع کر دیا گیا۔ لیکن اس کی کثیر مانگ کی وجہ سے اسے پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع کر دیا گیا ہے۔ اس کی قیمت صرف ۰.۵۰ پیسے فی پمفلٹ ہے (علاوہ محصول ڈاک)۔ اسے زیادہ سے زیادہ تعداد میں منگا کر اس کی اشاعت عام کریں۔

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام)

INSURE » with

Sterling Insurance Coy. Ltd.

TRANSACTS : MOTOR, FIRE, MARINE
& MISC. INSURANCES

BRANCHES ALL OVER PAKISTAN

HEAD OFFICE :
26, Shahrah-e-Quaid-e-Azam
P.O. Box No. 119, LAHORE
Telephone No. 54245

KARACHI OFFICE :
503-504, Muhammadi House
11, Chundrigar Road, KARACHI
Telephone Nos. 231971, 224525

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ
إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ
جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا

O ye who believe! Fear God as He should be feared, and die not except in a state of Islam. And hold fast all together, by the Rope which God stretches out for you, and be not divided among yourselves,

ptc PREMIER TOBACCO INDUSTRIES LIMITED

مدیر اعلیٰ
حافظ عبد الرحمٰن مدنی

ماہنامہ **محدث** کی خصوصی پیشکش ایک جامع امثالی اور علمی شاہکار

مدیر
خواجہ عبد المنان راز

صفحات ۱۵۰
سفید کاغذ۔ آفسٹ طباعت

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نمبر منظر عام پر

قیمت ۳ روپیہ صرف
زرِ سالانہ ۱۰ روپیہ

جس میں ملک کے مشاہیر اہلِ علم حضرات کے علاوہ مولانا ابو الکلام آزادؒ اور قاضی سلیمان منصور پوریؒ کے غیر مطبوعہ نادر اور فکر انگیز مقالات ہدیۂ قارئین ہیں

چند لکھنے والے: سید ابو الاعلیٰ مودودی (تازہ غیر مطبوعہ تحریر)۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی۔ مولانا عنایت اللہ وارثی۔ پروفیسر خالد علوی۔ ثریا بتول۔ محمد امین رسالت مشن۔ ڈاکٹر امان اللہ خان۔ مولانا عزیز زبیدی۔ عاصم نعمانی۔ نظر زیدی۔ جسٹس بدیع الزمان کیکاؤس۔ حافظ عبد الرحمٰن۔ ابو سلمان شاہجہانپوری۔ آباد شاہ پوری۔ اختر راہی اور ——— کئی دوسرے مشاہیر

شعرائے کرام: احسان دانش۔ عبد العزیز خالد۔ منظور احسن عباسی۔ عارف عبد المتین۔ حفیظ تائب۔ شفیق کوٹی ——— طاہر قریشی۔ عبد الرحمٰن عاجز۔ خواجہ عبد المنان راز

مستقل خریداروں کے لئے خاص رعایت ——— تاجر حضرات کے لئے معقول کمیشن

مجلس التحقیق الاسلامی گارڈن ٹاؤن لاہور ۱۶ ٹیلیفون ۸۵۵۰

پرویز صاحب کی معرکہ آرا انگریزی کتاب

ISLAM: A CHALLENGE TO RELIGION.

جس نے اپنے ملک کے علاوہ یورپ اور امریکہ کے اربابِ فکر و نظر سے بھی خراجِ تحسین حاصل کیا ہے۔

قیمت ۱۔ دبیز بورڈ کور ۲۰/- روپے
قیمت ۲۔ خوبصورت جلد گرد پوش کے ساتھ ۳۰/- روپے

محصول ڈاک اور پیکنگ علاوہ

جلد حاصل کیجئے۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی۔ گلبرگ ۲ لاہور

لاہور میں سپیئر پارٹس کی مشہور دکان

سٹینڈرڈ آٹو موبائلز

پر تشریف لائیے

ڈیلرز سٹیڈرڈ ٹس ۔ ٹرک ڈیزل پارٹس
بیشلٹ چوڈاج، بیڈفورڈ، لی لینڈ، بی۔ ایم۔ سی

۱۳۵ ۔ بادامی باغ لاہور ٹیلیفون 69012

ادارہ طلوع اسلام کی مطبوعات کی قیمتیں

ادارہ طلوع اسلام ایک مشنری ادارہ ہے کاروباری نہیں، اس لئے ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کے شائع کردہ لٹریچر کی اشاعت زیادہ سے زیادہ ہو اور قیمتیں کم سے کم۔ لیکن سامانِ کتابت وطباعت اور کاغذ کی ہوشربا گرانی اور اجرتوں میں اضافہ نے ہمیں مجبور کر دیا ہے کہ ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتابوں کی قیمتوں میں تھوڑا سا اضافہ کر دیا جائے۔ ان کی قیمتیں اب حسب ذیل ہوں گی۔

ان قیمتوں میں پیکنگ اور ڈاک کا خرچ شامل نہیں!

نام کتاب	قیمت
مفہوم القرآن (پارہ اول)	۳/۵۰ پیسے
" " (پارہ ۲ تا پارہ ۲۸)	۲/۷۵ روپے فی پارہ
" " (پارہ ۲۹، ۳۰) یکجا	۶/۵۰ "
" " (پارہ ۳۰)	۴/۵۰ "
مفہوم القرآن (جلد اول)	۲۶/- روپے
مفہوم القرآن (جلد دوم)	۳۰/- "
مفہوم القرآن (جلد سوم)	۳۵/- "
مکمل سیٹ	۹۰/- "
لغات القرآن (جلد اول)	۲۶/- روپے
لغات القرآن (جلد دوم)	۲۶/- "
لغات القرآن (جلد سوم)	۲۰/- "
لغات القرآن (جلد چہارم)	۲۶/- "
مکمل سیٹ	۸۰/- روپے
اسلام کیا ہے؟ (اعلیٰ)	۱۰/- روپے
اسلام کیا ہے؟ (سستا ایڈیشن)	۶/- روپے
انسان نے کیا سوچا؟	۱۵/- روپے
ابلیس و آدم	۱۵/- روپے

نام کتاب	قیمت
جوئے نور	۱۵/- روپے
برق طور	۱۵/- "
کتاب التقدیر	۱۵/- "
قائد اعظم کے تصور کا پاکستان	۱۲/- "
معراج انسانیت	۲۵/- "
بہار نو	۵/- "
سلسبیل	۱۰/- "
فردوس گم گشتہ	۱۰/- روپے
مقام حدیث	۵/- "
اسلامی معاشرت	۴/- "
اسباب زوال امت	۲/- "
جہاد	۲/۵۰ روپے
قرآنی قوانین و اقتدار	۴/- "
قرآنی فیصلے (جلد اول)	۵/- روپے
قرآنی فیصلے (جلد دوم)	۵/- "
قرآنی فیصلے (جلد سوم)	۵/- "
مکمل سیٹ	۱۵/- روپے

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
سلیم کے نام (جلد اول)	-/۱۰ روپے	عالمگیر افسانے	-/۱ روپیہ
سلیم کے نام (جلد دوم)	" -/۱۰	منشورِ آزادی	" -/۱
سلیم کے نام (جلد سوم)	" -/۱۰	پرنسپلز آف لا میکنگ ان اسلام (انگریزی)	۲/۵۰ روپے
مکمل سیٹ	-/۳۰ روپے		
طاہرہ کے نام	-/۶ روپے	دھتکارے ہوئے انسان	" -/۵
عربی خود سیکھئے	" -/۶	جمع القرآن (علامہ تمنا عمادی مرحوم)	" ۲/۵۰
پاکستان کا معمارِ اول	" ۲/۵۰	تاریخ الامت (جلد اول)	-/۲ روپے
الفتنۃ الکبریٰ (طٰہٰ حسین)	-/۸ روپے	" " (جلد دوم)	" -/۳
فجر الاسلام (جلد اول)	" -/۵	" " (جلد سوم)	" -/۳
فجر الاسلام (جلد دوم)	" -/۵	" " (جلد چہارم)	" -/۳
اسلام پر کیا گزری؟	" -/۸	" " (جلد پنجم)	" -/۴
(از علامہ امین مصری)		" " (جلد ششم)	" -/۴
منزل بہ منزل	-/۸ روپے	" " (جلد ہفتم)	" -/۳
جہانِ فردا	" -/۸	" " (جلد ہشتم)	" -/۳
ISLAM: A CHALLENGE TO RELIGION.	(مجلد) -/۳۰ روپے	از علامہ اسلم جیراجپوری مرحوم مکمل سیٹ	-/۲۵ روپے
پیپر بیک	" -/۲۰	QURAN AND	
قتلِ مرتد	" -/۲	PHENOMENA OF NATURE	-/۲۵ روپے
انسانیت کا آخری سہارا	" -/۱	از ڈاکٹر سید عبدالودود	

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

لاہور میں محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

ہر اتوار۔ صبح ۸ بجے بمقام —— ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

(عورتوں کے لئے پردہ کا خاص انتظام ہوتا ہے)

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ٹیلیفون [illegible]